کارل مارکس

KARL MARX

اجرتی محن اور سرمایہ

Wage-Labour and Capital

Delivered: December 1847

Source: Wage Labour and Capital, the original 1891 pamphlet

Edited/Translated: Frederick Engels

First Published (in German): Neue Rheinische Zeitung, April 5-8 and 11, 1849

نظر ثانی اردو ترجمہ: ابن حسن

1891 کے ایڈیشن پر فریڈرک اینگلز کا دیباچہ

یہ تصنیف (1) "Neue Rheinische Zeitung" (2) اخبار میں ایڈیٹوریل کے سلسلہ مضامین کے طور پر 4 اپریل 1849 سے اگلی اشاعتوں تک نکلتی رہی۔ کارل مارکس نے 1847 میں بروسلز میں جرمن مزدوروں کی سوسائٹی (3) کے سامنے جو لیکچر دیئے تھے، وہی لیکچران مضامین کی بنیاد ہیں۔ تب یہ سلسلہ نا تمام رہا۔ اخبار کے شمارے 269 میں مضمون "باقی آئندہ" پر رک گیا اور آئندہ کی نوبت نہیں آئی کیوں کہ ایک بعد ایک واقعات کا تانتا بندھ گیا۔ ہنگری پر روسیوں نے چڑھائی کر دی (4) ڈریسڈین میں، ایسر لون میں، ایلبر فیلڈ میں، پفالتس اور باڈین میں بغاوتیں (5) ہو گئیں نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود اخبار پر ہی پابندی لگ گئی (19 مئی 1849)۔ مضمون کے باقی سلسلے کا مسودہ بھی کارل مارکس کے انتقال کے بعد ان کے کاغذوں میں نہیں مل سکا (6)۔

مزدوری اور سرمایہ (Wage labour and capital) کئی ایڈیشنوں میں علیحدہ نکل چکا ہے۔ پمفلٹ کی صورت میں آخری ایڈیشن "سوئس کوآپریٹو پریس" نے ہوٹنگن زورخ سے 1884 میں شائع کیا۔ آج تک جتنے ایڈیشن نکلے سب میں اصل کے الفاظ جوں کے توں موجود ہیں۔ زیر نظر ایڈیشن کم از کم دس ہزار کی تعداد میں پرچار پمفلٹ کی حیثیت سے نکلنے والا ہے لہٰذا یہ سوال سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کیا موجودہ حالات میں خود مارکس اس کو جوں کا توں شائع کرنے کی اجازت دے دیتا۔

1840 کی دہائی میں مارکس نے سیاسی معاشیات پر اپنی تنقید مکمل نہیں کی تھی۔ یہ کام کہیں 1860 سے کچھ پہلے ہو سکا۔ نتیجہ یہ کہ جو تحریریں "سیاسی معاشیات کی تنقید پر" کی اشاعت (1859) سے پہلے ہو چکی تھیں، وہ بعض مقامات پر ان تحریروں سے ہٹی ہوئی ہیں جو 1859 کے بعد لکھی گئیں۔ ان میں بعض ایسی ترکیبیں، بلکہ پورے پورے جملے مل جاتے ہیں کہ اگر مارکس کی بعد والی تحریروں کی روشنی میں دیکھا جائے تو انہیں بے جا تو کیا غلط قرار دینا پڑے گا۔ اب، ظاہر بات ہے کہ معمولی ایڈیشنوں میں، جو عام پبلک کیلئے تیار ہوتے ہیں شروع کے نقطہ نظر کی بھی گنجائش رہنی چاہیے تاکہ اس سے مصنف کی ذہنی اٹھان کا پتہ چلتا رہے۔ مصنف اور پبلک دونوں کو قطعی طور پر یہ حق حاصل ہے کہ ان پرانی تحریروں کو جوں کا توں شائع ہونے دیں۔ اس قسم کے ایڈیشنوں کے موقع پر مجھے خود اس کا گمان بھی نہ گزرتا کہ ان عبارتوں میں سے ایک لفظ بھی ادھر سے ادھر کرنا ہے۔

مگر جب نئے ایڈیشن کا یہ مقصد قرار پایا کہ اسے مزدوروں میں ہی عملی پروپیگنڈے کے لئے استعمال کیا جائے تو پھر یہ اور بات ہے۔ ایسی حالت میں خود مارکس ان پرانے بیانات کو جو 1849 سے چلے آ رہے ہیں اپنے تازہ نقطہ نظر کے سانچے میں ضرور ڈھال کر پیش کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ میں وہی طریق اختیار کر رہا ہوں جو مارکس کرتا کہ خاص اس ایڈیشن کے لئے اسے بھی وہی کچھ ترمیمیں اور اضافے کرنے پڑتے جو اس مقصد کی ہر پہلو سے تکمیل کے لئے لازمی ہیں۔ لہٰذا میں پڑھنے والے سے پیشگی ہی کہہ دینا چاہتا ہوں: یہ پمفلٹ ویسا نہیں ہے جیسا مارکس نے 1849 میں لکھا تھا بلکہ تقریباً ویسا ہی جیسا وہ 1891 میں لکھتا۔ پھر پمفلٹ کی اصل عبارت اتنی بڑی تعداد میں شائع ہو چکی ہے کہ فی الحال اسی کی موجودگی کافی ہے، جب تک کہ میں اسے پھر سے بغیر کسی کمی بیشی کے بعد میں مکمل ایڈیشن میں شائع نہ کر دوں۔

میں نے جو تبدیلیاں کی ہیں وہ گھوم پھر کر ایک نقطہ پر آتی ہیں۔ اصل عبارت میں کہا گیا تھا کہ مزدور اپنی محنت سرمایہ دار کے ہاتھ اجرت کی خاطر بیچتا ہے، یہاں کہا گیا ہے کہ مزدور اپنی قوت محنت بیچتا ہے۔ محنت کی بجائے قوت محنت کر دینے کی ایک وجہ ہے میرے پاس یہ وضاحت مزدوروں کے سامنے کرنی ہے تاکہ وہ خود دیکھ لیں کہ یہاں ہم لفظی الٹ پھیر سے کام

نہیں لے رہے بلکہ اس کے برخلاف یہ پوری سیاسی معاشیات کا ایک نہایت اہم نقطہ ہے۔ بورژوازی کے سامنے بھی وضاحت کرنی ہے تاکہ وہ قائل ہو جائے کہ ان پڑھ مزدور، جن کی خاطر مشکل سے مشکل معاشی تجزیئے کو اتنا عام فہم بنایا جاسکتا ہے، وہ ہمارے (بورژوازی کے) اونچی ناک والے ان "تعلیم یافتہ" لوگوں سے کس قدر بلند و برتر ہیں جن کے لئے اس قسم کے باریک اور پیچیدہ سوالات زندگی بھر ایک معمہ بنے رہتے ہیں۔

اوپر سے جو سیاسی معاشیات (7) چلی آرہی تھی اس نے صنعتی معمول سے "مینوفیکچرر" (کارخانہ دار) کا موجودہ تصور لے لیا ہے۔ یعنی وہ شخص جو اپنے مزدور کی محنت خریدتا ہے اور اس کی رقم ادا کرتا ہے۔ مینوفیکچرر کی کاروباری ضرورتوں کے لئے، حساب کتاب کے لئے اور قیمتوں کا حساب نکالنے کے لئے، تو یہ تصور پورا پڑتا تھا، مگر جب سادہ لوحی سے اسے سیاسی معاشیات میں لاکر جوڑ دیا گیا تو اس نے واقعی حیرت انگیز الجھاؤ اور گمراہی پھیلا دی۔

معاشیات اس حقیقت کو مانتی ہے کہ ہر ایک مال کی قیمتیں برابر ادلتی بدلتی رہتی ہیں اور اسی میں وہ مال بھی شمار ہوتا ہے جسے معاشیات کا علم "لیبر" یا محنت کا نام دیتا ہے؛ قیمتوں کا چڑھنا اترنا بہت ہی مختلف حالات کے باعث ہوا کرتا ہے، جن حالات کا اکثر تو خود مال کی پیداوار سے بھی کسی قسم کا واسطہ نہیں ہوتا یہاں تک کہ قاعدے کی رو سے قیمتوں کا فیصلہ محض اتفاق وقت سے ہوتا رہتا ہے۔ پس جوں ہی سیاسی معاشیات ایک باضابطہ علم کی صورت میں سامنے آئی (8) تو اس کے اولین فرضوں میں سے یہ فرض چاہیے تھا کہ اس قانون کا پتہ لگائے جو مال کی (چڑھتی اترتی) قیمتوں کا ظاہراً فیصلہ کرنے والے اس، اتفاق وقت، کے پیچھے چھپا ہوا ہے اور جو دراصل خود اس اتفاق یا چانس کو اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔ مال کی قیمتوں کے دائرے میں جو لگاتار چڑھتی اترتی اور ڈانواڈول رہتی ہیں، سیاسی معاشیات نے اس پائیدار مرکز کو تلاش کیا جس کے چاروں طرف قیمتوں کی یہ مندی اور تیزی گھومتی رہتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس علم نے مال کی قیمتوں سے شروعات کی تاکہ مال کی قدر (value) کا پتہ نکالا جائے، جو قیمتوں کے سارے الٹ پھیر کو سمجھا جاسکتا ہے اور آخر کار ساری قیمتیں اسی ویلیو سے متعلق ہو جاتی ہیں

-

چنانچہ کلاسیکی معاشیات نے تلاش سے یہ معلوم کر لیا کہ کسی مال کی ویلیو (قدر) اس محنت سے قرار پاتی ہے جو اس میں لگی ہو اور جو اس مال کی پیداوار کے لئے ضروری ہو۔ یہ وضاحت دے کر اس علم کی تسکین ہو گئی۔ ہم بھی اسی نکتے پر ذرا ٹھہر جائیں۔ میں غلط فہمی سے بچنے کیلئے پڑھنے والوں کو یہاں اتنا جتا دینا چاہتا ہوں قیمت اور قدر کی یہ وضاحت آج کے زمانے میں بالکل ناکافی ہو چکی ہے۔ مارکس وہ پہلا شخص تھا جس نے گہرائی میں اتر کر تحقیقات کی کہ محنت کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو قدر پیدا کرتی ہے اور اسی تحقیق میں سراغ نکالا کہ مال کی پیداوار میں جتنی بھی محنت ظاہراً یا درحقیقت لگنی ضروری ہے، وہ سب کی سب کسی حالت میں بھی اتنی ویلیو (قدر) پیدا نہیں کرتی جتنی محنت اس پر خرچ کی جاتی ہے۔ پس آج اگر یوں ہی ریکارڈو جیسے ماہرین معاشیات کے ساتھ ہم کہتے ہیں کہ کسی مال کی قدر اس محنت سے طے پاتی ہے جو محنت اس مال کی پیداوار میں لگی ہو تو یہ کہتے وقت ہماری نظر میں وہ شرائط بھی رہتی ہیں جو مارکس نے قائم کی ہیں۔ یہاں اسی قدر جتانا کافی تھا۔ باقی مارکس کی تصنیف "سیاسی معاشیات کی تنقید پر" (1859 کی اشاعت) میں دیکھا جائے اور "سرمایہ" کی پہلی جلد میں

-

مگر جیسے ہی ماہرین معاشیات نے "قدر" کا تعین محن سے کرنے کے اصول کو اس شے پر لاگو کیا جسے "محن" کہتے ہیں، وہ ایک بعد ایک تضادات میں جکڑے گئے۔ سوال یہ ہوا کہ "محن" کی قدر کا فیصلہ کس چیز سے ہوتا ہے۔ جواب ملا کہ اس محن سے جو لازمی طور سے کھپی ہو۔ مگر مزدور جتنی محنت ایک دن میں، ایک ہفتے، ایک مہینے، ایک سال میں کرتا ہے، اس میں مختلی مقدار کیا ہے؟ جواب یہ کہ اس میں ایک دن، ایک ہفتے، ایک مہینے، ایک سال کی محن لگی ہے۔ اگر مختلی میں تمام قدریں (values) ناپی جاتی ہیں تو پھر یقیناً ہم "مختلی قدر" کو خود محنت سے ہی ناپ سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہمیں صرف اتنا معلوم ہو کہ محن کی ایک گھنٹے کی "قدر" ایک گھنٹے کی محنت کے برابر ہے، تب بھی ہمیں قطعی علم نہیں کہ گھنٹے بھر کی محن کی "قدر" کتنی ہوتی ہے۔ اس سے تو ہم اپنے مقصد کے ایک انچ بھی نزدیک نہیں پہنچے، صرف چکر کاٹتے رہ جاتے ہیں۔

تب کلاسیکی معاشیات نے دوسری سمت بڑھنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا: کسی مال کی "قدر" اس کی پیداوار کی لاگت کے برابر ہوتی ہے۔ تو پھر سوال ہے کہ محنت کی پیداوار میں کتنی لاگت آتی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کیلئے ماہرین معاشیات کو منطق کے ساتھ کچھ زور زبردستی کرنی پڑی۔ بدقسمتی سے محنت کی پیداوار کی لاگت نکالنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے یہ حساب جمایا کہ (محنت کی پیداوار نہ سہی) مزدور کی پیداوار کی لاگت کتنی آتی ہے۔ یہ حساب ٹھیک ٹھیک بتایا جاسکتا ہے۔ اگرچہ یہاں بھی وقت اور حالات کی مناسبت سے لاگت مختلف ہو جاتی ہے، تاہم سماج کی ایک مقرر ہحالت، ایک مقررہ علاقے یا مقام، اور پیداوار کی کسی مقررہ شاخ میں کوئی مخصوص لاگت آتی ہے، کم از کم اس لاگت کی خاصی تنگ حد بندی کی جاسکتی ہے۔ فی الحال ہم سرمایہ داری پیداوار کے سائے میں جی رہے ہیں جہاں آبادی کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد کا طبقہ اسی صورت میں زندگی بسر کرسکتا ہے کہ وہ اجرت کے بدلے ان لوگوں کے لئے کام کرے جو پیداوار کے ذریعوں، یعنی اوزاروں، مشینوں، کچے مال اور ضروریات زندگی کے مالک ہوتے ہیں۔ موجودہ طریق پیداوار اور اس کے لحاظ سے مزدور کی پیداوار کی لاگت اتنی ہوئی جتنی ان ضروریات زندگی کی مقدار ــــ یا ان کی خریداری کے لئے درکار اوسط رقم جو مزدور کو کام پر رکھنے کیلئے، کام کے قابل رکھنے کے لئے اس کی بدلی میں دوسرے مزدور کو لانے کے لئے، بڑھاپے، بیماری یا موت کی وجہ سے اس کی جگہ نئے مزدور بھرتی کرنے کے لئے ضروری ہو، یعنی یوں کہنا چاہیے کہ مزدور طبقے کی مطلوبہ تعداد کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری رقم۔

چلئے فرض کریں کہ ان ضروریات زندگی کی قیمت اوسطاً تین مارک روزانہ ہوتی ہے۔

اس حساب سے مزدور کو اس سرمایہ سے جو کام پر لگاتا ہے، تین مارک روزانہ ملتے ہیں۔ تین مارک کے بدلے سرمایہ دار بارہ گھنٹے روزانہ اس سے کام لیتا ہے اور اس طرح حساب جماتا ہے:

فرض کیجئے کہ مزدور، (ایک مستری) کو مشین کا ایک پرزہ بنانا ہے جو وہ ایک دن مین تیار کر لیتا ہے۔ پرزے کا کچا مال_ لوہا اور پیتل جو پہلے سے تیار کی ہوئی ایک مقررہ شکل میں لگتا ہے، اس کی قیمت تھی 20 مارک۔ بھاپ کے انجن میں کوئلہ خرچ ہوا، پھر انجن، خراد اور دوسرے اوزار جو اس کام میں استعمال ہوئے، ان کی ایک دن کی گھسائی اور ٹوٹ پھوٹ___ یہ سب ملا کر ایک دن اور ایک آدمی کے کام میں آنے والی مقدار ناپی جائے تو سمجھئے کہ ایک مارک کی قدر ہوگئی۔ ہم نے شروع میں فرض کیا تھا کہ ایک دن کی اجرت تین مارک ہوتی ہے۔ تو اس ایک پرزے کی تیاری پر 24 مارک خرچ ہوگئے۔ اب سرمایہ دار یوں حساب کرتا ہے کہ اوسط میں اسے گاہک سے 27 مارک ملنا چاہیے_ یعنی جتنی رقم اس نے لگائی ہے اس سے 3 مارک زیادہ۔

یہ 3 مارک کہاں سے آئے جو سرمایہ دار نے اپنی جیب میں ڈال لئے؟ کلاسیکی معاشیات کا دعویٰ تھا کہ جتنے مال بازار میں آئے ہیں وہ اوسط میں اپنی قدر پر بکتے ہیں، یعنی ان قیمتوں پر جو مال میں لگی ہوئی لازمی محنت کی مقدار سے میل کھاتی ہیں۔ مشین کے اس پرزے کے اوسط قیمت جو 27 مارک قرار پائی ہے، وہ اس لحاظ سے پرزے کی قدر کے برابر ہونی چاہیے_ یعنی اسمحنکی برابر جو پرزہ تیار کرنے میں شامل ہے۔ ان 27 مارک میں سے 21 مارک کی قدر تو تبھی موجود تھی جب مستری نے اسے ہاتھ لگایا۔ 20 مارک کچے مال کی قدر، ایک مارک میں دن بھر کے کوئلے کا خرچ، ان مشینوں اور اوزاروں کا خرچ جو مال کی تیاری میں استعمال ہوئے اور اس رقم میں ان کی گھسائی اور ٹوٹ پھوٹ کی لاگت کے برابر ہوگئی۔ اب 27 میں سے 6 مارک ایسے رہے جو کچے مال کی قدر سے بڑھائے گئے ہیں۔ ان ماہرین معاشیات کے مفروضے کے مطابق تو نکلتا ہے کہ یہ 6 مارک صرف اس محنت کا پھل ہیں جو مستری نے کچے مال پر لگائی ہے۔ اس نے جو 12 گھنٹے محنت کی، اسی کی بدولت 6 مارک کی ایک اور "قدر" (قدر) پیدا ہوئی۔ اس طرح سے بالآخر ہم کو علم ہو جاتا ہے کہ محنتکی قدر (قدر محنت) کیا ہوتی ہے۔

کیا کہا چھ مارک؟ وہ مستری پکارتا ہے "ٹھہرو، مجھے تو صرف 3 مارک ہی ملے ہیں۔ میرا سرمایہ دار تو قسمیں کھا کھا کر کہتا ہے کہ میں جو 12 گھنٹے کام کیا اس کی قدر 3 مارک ہوتی ہے۔ اگر میں 6 مانگوں تو وہ مذاق اڑاتا ہے۔ ان دونوں باتوں میں تعلق کیا ہے؟"۔

اگر ہم پہلے محنتکی قدر نکالتے وقت چکر میں پھنس گئے تھے تو اب ایسے تضاد میں گرفتار ہوئے ہیں جس سے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں۔ ہمیں محنتکی قدر تلاش کرنی تھی اور مل گیا اتنا کچھ جو اٹھائے نہ اٹھے۔ مزدور کے سامنے 12 گھنٹے کی محنت کی قدر ہے 3 مارک، سرمایہ دار کے سامنے وہ ہے 6 مارک، جس میں سے 3 مارک وہ مزدور کو دیتا ہے تین اپنی جیب میں ڈالتا ہے۔ اس لحاظ سے محنت کی ایک نہیں، دو دو قدریں نکلیں اور وہ بھی ایک دوسری سے بالکل جداگانہ۔

ان قدروں میں جو رقم کی صورت سامنے آئی ہیں، جب محن کے وقت میں تبدیل کر کے دیکھتے ہیں تو یہ تضاد اور بھی واہیات نظر آتا ہے۔ 12 گھنٹے کے محن میں 6 مارک کی اور قدر پیدا کی گئی یعنی 6 گھنٹے میں 3 مارک کی___ اتنی رقم کی جو مزدور کو 12 گھنٹے کام کر کے ملتی ہے۔ 12 گھنٹے کے کام کے بدلے میں مزدور کو اتنی "قدر" ملی جو 6 گھنٹے کی محنت کی پیداوار کے برابر ہے۔ اب یا تو محن کی دو قدریں ہیں جس میں ایک قدر دوسری قدر کے دگنی ہوتی ہے، یا پھر 12 کا عدد 6 کے برابر ہوتا ہے۔ دونوں حالتوں میں نتیجہ بکواس۔

چاہے کتنا ہی ہاتھ پاؤں ماریے، اس تضاد سے باہر نکلنے کی سبیل اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک ہم محن کی خرید و فروخت اور محن کی قدر پر اڑے رہیں گے۔ ماہرین معاشیات پر بھی یہی بپتا پڑی ہے۔ کلاسیکی سیاسی معاشیات کا آخری نمائندہ ریکارڈو اور اس کا مکتب خیال بھی اس گتھی کے کھنور میں پھنس کر رہ گیا۔ استادانہ معاشیات کو اس اندھی گلی سے باہر نکلنے کی راہ نہیں سوجھی۔ وہ شخص جس نے نکلنے کی راہ سجھائی، وہ تھا کارل مارکس۔

وہ جسے ماہرین معاشیات محن کی پیداوار کی لاگت سمجھتے تھے، وہ محن کی نہیں بلکہ خود جیتے جاگتے مزدور کی پیداوار کی لاگت تھی۔ اور وہ چیز جو سرمایہ کے ہاتھ مزدور نے فروخت کی، وہ اس کی محن نہیں تھی۔ مارکس کہتا ہے کہ "جیسے ہی اس کا محن شروع ہوتا ہے، وہ خود اس کی نہیں رہ جاتا، لہٰذا بیچنے پر اس کا کوئی اختیار نہیں رہتا"۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ وہ اپنی آئندہ کی محن فروخت کرے، یعنی کام کی ایک خاص مقدار ایک مقررہ وقت میں کرنے کی ذمہ داری لے۔ اس طرح کرنے میں وہ بہرحال اپنے محن کا سودا نہیں کرتا (کیونکہ ابھی تو اسے وہ کام کر کے دینا ہے) بلکہ ہوتا یہ ہے کہ مزدور اپنی قوت محن کو مقررہ اجرت کے بدلے سرمایہ دار کے سپرد کر دیتا ہے:

اگر وقت کے حساب سے کام مقرر ہو تو مقررہ وقت میں، اور اگر کام کے ناپ سے اجرت ملتی ہو تو ایک مقررہ کام کے لئے۔ وہ اپنی قوت محن کو کرائے پر اٹھا دیتا ہے یوں کہیے کہ بیچ دیتا ہے۔ مگر یہ قوت محنت اس کے وجود سے کوئی الگ چیز نہیں ہوتی، اس کے دم کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس قوت محنت کی پیداوار کی لاگت وہی ہوگی جو خود مزدور کی پیداوار کی لاگت ہو۔ ماہرین معاشیات جس چیز کو محن کی پیداور کی لاگت کہنے چلے تھے، وہ دراصل خود مزدور کی پیداوار کی لاگت نکلی اور اسی کے ساتھ ساتھ قوت محن کی پیداوار کی لاگت قرار پائی۔ اب ہم قوت محن کی پیداوار کی لاگت سے ہٹ کر آگے قوت محن کی قدر پر آ جائیں تا کہ اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ ایک خاص قسم کی قوت محنت کی پیداوار کے لئے سماجی لحاظ سے محن کی کم از کم کتنی مقدار ضروری ہوتی ہے۔ مارکس نے ("سرمایہ" کی جلد اول، باب 4، فصل 3 میں) قوت محنت کی خرید و فروخت پر بحث کرتے ہوئے یہی کیا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ جب مزدور نے اپنی قوت محن کو سرمایہ دار کے ہاتھ بیچ دیا، دنوں یا کام کے حساب سے پہلے سے طے کی ہوئی اجرت کے بدلے اسے سرمایہ دار کے سپرد کر دیا تو پھر کیا ہوتا ہے؟ سرمایہ دار مزدور کو اپنے کارخانے یا فیکٹری میں لے جاتا ہے جہاں کام کی تمام ضروری چیزیں، یعنی کچا مال، کارخانے میں کھپنے والا دوسرا سامان (کوئلہ، رنگ وغیرہ)، اوزار، مشین، سب پہلے سے مہیا ہیں۔ یہاں پہنچ کر مزدور اپنے کام کو ہاتھ میں لیتا ہے۔ اس کی روزانہ اجرت، جیسا کہ اوپر کہہ چکے ہیں، فرض کیجئے 3 مارک ہوگی اب چاہے یہ اسے روز کی مزدوری کے حساب سے ملے یا مقررہ کام کی اجرت کے طور پر، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں پہنچ کر ہم پھر فرض کئے لیتے ہیں کہ 12 گھنٹے کے اندر مزدور اپنی محنت سے استعمال ہونے والے کچے مال کی

قدر میں 6 مارک قدر بڑھا دیتا ہے۔ یہ 6 مارک کی رقم سرمایہ دار کو اس وقت وصول ہوگی جب وہ تیار شدہ چیز بیچ لے گا۔ اس میں سے مزدور کو وہ 3 مارک کی اجرت ادا کر دے گا۔ باقی 3 تین مارک اپنے پاس رکھ لے گا۔ اب دیکھئے کہ اگر مزدور 12 گھنٹے میں 6 مارک کی قدر پیدا کرتا ہے تو وہ 6 گھنٹے میں 3 مارک کی قدر پیدا کرے گا۔ لہٰذا جب ایک مزدور نے سرمایہ دار کے لئے چھ گھنٹے کام کر دیا تو گویا اپنی اجرت میں جو 3 مارک کی قدر پائی ہے، اس کے بدلے کی قدر ہاتھ کے ہاتھ ادا کر دی۔ چھ گھنٹے کے کام کے بعد دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ ایک کا دوسرے پر کوئی واجب بقایا نہیں رہا۔

اب کے سرمایہ دار پکارتا ہے "ٹھہر جاؤ۔ میں نے، مزدور کو پورے دن کے 12 گھنٹے کے لئے لگایا ہے۔ 6 گھنٹے میں تو صرف آدھا دن ہوا۔ باقی کے 6 گھنٹے بھی کام کر کے جاؤ، تب بقایا ادا ہوگا"۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ مزدور کو "اپنی خوشی سے" وہ شرط پوری کرنی ہے جس کے مطابق دونوں میں طے ہوا تھا کہ پورے 12 گھنٹے کام کرے اور اپنی محنت سے وہ چیز تیار کر دے جس کی لاگت ہے محنت کے 6 گھنٹے۔

مقررہ کام پورا کرنے کی جو اجرت دی جاتی ہے وہاں بھی یہی صورت حال ہے۔ فرض کیجئے ایک مزدور 12 گھنٹے کے وقت میں کسی مال کے بارہ عدد تیار کرتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک عدد پر کچا مال اور مشینوں کی گھسائی اور ٹوٹ پھوٹ ملا کر دو مارک لاگت آتی ہے اور ڈھائی مارک فی عدد بنتا ہے۔ تو ہمارے اسی مفروضے کو مطابق سرمایہ دار فی عدد تیاری پر مزدور کو 25 پفینگ (چوتھائی مارک) ادا کر دیتا ہے۔ اس طرح مزدور کو بارہ عدد بنانے کے تین مارک ملے، جنہیں کمانے کے لئے اسے بارہ گھنٹے کام کرنا پڑا۔ سرمایہ دار کو بارہ عدد پر تیس مارک وصول ہوں گے۔ کچے مال، ٹوٹ پھوٹ یا گھسائی کے چوبیس مارک اس میں سے نکال دیئے، چھ مارک بچے۔ ان چھ میں سے تین مارک اس نے مزدور کو اجرت کے دیئے، تین پھر بچائے۔ بالکل وہی پہلے کا نتیجہ نکلا۔ اس صورت میں بھی مزدور نے چھ گھنٹے اپنے لئے کام کیا، یعنی اپنی مزدوری کی ادائیگی کیلئے (بارہ گھنٹوں میں سے صرف آدھا وقت اپنے لئے) اور باقی چھ گھنٹے سرمایہ دار کیلئے۔

معاشیات کے بہترین ماہرین کو جو مصیبت پیش آئی ہے وہ اس وقت تک چلتی رہے گی جب تک وہ اپنا حساب "محن کی قدر" سے شروع کرتے رہیں گے، اور جہاں ہم نے اس کے بجائے قوت محن کی قدر سے شروع کیا، وہ مصیبت بھی گئی۔ آج کے ہمارے سرمایہ دارانہ سماج میں قوت محن ایک شے ہے جیسے اور اشیا (فروخت کے لئے) ہوتی ہیں۔ یہ بھی ایسی ہی شے ہے_ مگر ہے بھی انوکھا شے۔ اس شے کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قدر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، قدر کا سرچشمہ ہے، اور اس میں بھی شک نہیں کہ اگر سلیقے سے کام لیا جائے تو جتنی قدر اس شے کے اندر موجود ہے اس سے زیادہ ہی دے ڈالتی ہے۔ پیداوار کی جو موجودہ صورت حال ہے اس میں انسانی قوت محن ایک دن کے اندر اس سے زیادہ قدر تو خیر پیدا کر ہی دیتی ہے جتنی خود رکھتی ہے یا جتنی اس پر لاگت آتی ہے، اس کے سوا، ہر ایک نئے سائنسی انکشاف کے ساتھ، ہر ایک نئی ٹکنیکی ایجاد کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ قوت محن پر جتنی لاگت ایک دن میں آتی ہے، اس لاگت کے تناسب سے زائد پیداوار بھی بڑھتی جاتی ہے، اسی نسبت سے، محن کے دن کا وہ حصہ جو مزدور اپنی دن بھر کی اجرت کے بدلے میں پیش کرتا ہے، برابر کم ہوتا جاتا ہے_ نتیجہ ظاہر ہے کہ محن کے دن کا وہ حصہ جس میں مزدور کو اپنا محن سرمایہ دار کو بے معاوضہ پیش کرنا ہوتا ہے، وہ برابر بڑھتا چلا جاتا ہے۔

یہ ہے ہماری آج کی سوسائٹی کا پورا معاشی ڈھانچہ: مزدور طبقہ ہی ہے جو تمام قدریں پیدا کرتا ہے۔ کیوں کہ قدر محنت کا ہی دوسرا نام ہے۔ یہ وہ نام ہے جس سے آج کے سرمایہ دارانہ سماج میں محن کی وہ مقدار مراد لی جاتی ہے جو سماجی طور پر کسی مال کو تیار کرنے کے لئے لازمی ہو۔ جو قدر مزدور پیدا کرتے ہیں وہ بہر حال مزدوروں کی ملکیت نہیں ہوتی ہیں۔ وہ ان کی ملکیت ہو جاتی ہیں جو کچے مال، مشینوں، اوزاروں اور ایسے محفوظ سرمائے کے مالک ہوں جس کی بدولت مالک لوگ مزدور طبقے کی قوت محنت خرید سکیں۔ چنانچہ مزدور طبقہ اپنے ہاتھوں جتنا بھی سامان تیار کر کے ڈھیر لگاتا ہے، بدلے میں خود اس کا ایک حصہ جو سرمایہ دار طبقہ اپنے پاس رکھ لیتا ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ زمین کے مالک طبقے کے ساتھ اس کا بٹوارہ کر لیتا ہے، وہ حصہ ہر ایک نئے انکشاف یا نئی ایجاد کے ساتھ برابر بڑھتا جاتا ہے جب کہ مزدور طبقے کے ہاتھ پڑنے والا حصہ (فی کس کے انداز سے) یا تو بہت ہی آہستہ اور برائے نام بڑھتا ہے یا بالکل نہیں بڑھنے پاتا_ بلکہ بعض حالتوں میں تو وہ اور بھی گھٹ جاتا ہے۔

لیکن یہی انکشافات اور ایجادیں جو تیزی کے ساتھ روز بروز ایک دوسری سے آگے نکلتی جاتی ہیں، یہ انسانی محنت کی قوت پیداوار جو اس رفتار سے بڑھتی جارہی ہے جس کا پہلے کبھی گمان نہ تھا، آگے چل کر بالآخر ایسے ٹکراؤ تک پہنچا دیتی ہے جس میں آج کی سرمایہ دارانہ معیشت کے ٹکڑے اڑنے ہیں۔ ایک طرف تو دولت کے بے شمار انبار لگے ہوتے ہیں اور تیار شدہ سامان کی اتنی افراط ہوتی ہے کہ خریدار انہیں خرید نہیں پاتے، اور دوسری طرف سماج کے ان گنت لوگ پرولتاری بن چکتے ہیں، مزدوری پر کام کرنے والے رہ جاتے ہیں، خاص اسی باعث ان میں سکت نہیں ہوتی کہ سامان کی اس افراط میں اپنا حصہ بٹا سکیں۔ سماج جب اس طرح تقسیم ہو جاتا ہے کہ ایک چھوٹا سا لیکن نہایت دولتمند طبقہ، اور ایک بڑا لیکن ملکیت سے محروم اور مزدوری پر بسر کرنے والا طبقہ، تو اس کا نتیجہ ایسے سماج کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس میں ایک طرف تو دولت اور سامان کی کثرت سے دم گھٹنے لگے، دوسری طرف سماج کی اکثریت بمشکل، بلکہ نہ ہونے کے برابر، انتہائی محتاجی سے اپنا بچاؤ کر سکے۔ حالات کا یہ رخ روز بروز بے معنی اور فضول ہوتا جاتا ہے۔ اس کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ اس کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا سماجی نظام ممکن ہے جس میں موجودہ طبقاتی فرق ناپید ہو_ ایسا سماجی نظام جس میں غالباً مختصر سا دور محرومی یا مفلسی کا گزر جانے کے بعد، اگر چہ یہ دور بھی اخلاقی لحاظ سے بیش قیمت ہی ہوگا، جو بے پناہ پیداواری طاقتیں موجود ہیں ان کو باضابطہ طریقے سے کام میں لا کر، ترقی دے کر سب کو ایک سار کام سے لگا کر، گزر بسر کے اسباب، زندگی سے لطف اٹھانے کے اسباب، تمام جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو بڑھانے اور ان سے کام لینے کے اسباب، سماج کے تمام لوگوں کو برابر میسر آئیں گے اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی بھرپور ہوتے جائیں گے۔ یہ بات کہ مزدور ایسے سماجی نظام کو زبردستی حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ عزم کرتے جارہے ہیں، سمندر کے دونوں ساحلوں پر اپنا منظر دکھائے گی کل پہلی مئی کو اور اتوار کے دن تیسری

مئی کو (9)۔

30 اپریل 1891۔ لندن

فریڈرک اینجلز

"Vorwarts" نمبر 109، 13 مئی 1891 کے ضمیمے کے طور پر شائع ہوا۔ اور "Karl Marx "Lohnarbeit und Kapital (برلن 1891) پمفلٹ میں ضمیمے کے طور پر نکلا۔

****

کارل مارکس

اجرتی محن اور سرمایہ

مختلف سمتوں سے اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم نے ان معاشی تعلقات کا خاکہ پیش نہیں کیا جن میں آج کل کی طبقاتی اور قومی جدوجہد کی مادی بنیاد موجود ہے۔ ہم نے جان بوجھ کر ان تعلقات پر صرف سرسری گفتگو کی ہے جہاں سیاسی ٹکراؤ میں وہ اول حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ سب سے مقدم یہ تھا کہ موجودہ تاریخ کی رفتار میں اس تاریخی مواد سے جو ہمارے پاس فی الحال موجود ہے اور جو روزانہ سامنے آتا جا رہا ہے، یہ ثابت کیا جائے کہ فروری اور مارچ میں مزدور طبقے نے جو انقلاب (10) برپا کئے تھے، ان میں اس طبقے کی شکست کے ساتھ ساتھ مخالفوں یا حریفوں کو بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے، اور وہ حریف ہیں فرانس کے بورژوا ریپبلکن، اور فرانس کے کیا، پورے براعظم یورپ کے بورژوازی اور کسانوں کے طبقے جو جاگیر داری کے من مانی فرمانروائی کے مقابلے پر کھڑے ہوئے تھے۔ مزید یہ دکھایا جائے کہ فرانس میں "ایمان دارانہ ریپبلک" کو جو فتح ہوئی وہ ان تمام قوموں کی شکست ہے جو فروری کے انقلاب کو لبیک کہتے ہوئے آزادی کی خاطر جاں بازی کے ساتھ میدان میں اتری تھیں۔ یہ بھی ثابت کیا جائے کہ انجام کار انقلابی مزدوروں کی شکست کے ساتھ یورپ پھر پہلے کی سی دوہری غلامی میں مبتلا ہو گیا، وہی انگلستان اور روس کی دوہری غلامی۔ پیرس میں جون کے مہینے کا مقابلہ (32)، ویانا کا ہاتھ سے نکل جانا، برلن میں نومبر 1848 کا واقعہ، جو المیہ بھی تھا طربیہ بھی، پولینڈ، اٹلی اور ہنگری کی جان توڑ کوشش (37) اور آئرلینڈ کا بھوکوں مر کر گھٹنے ٹیک دینا، یہ ہیں بڑے بڑے واقعات جن میں یورپ کی وہ طبقاتی جدوجہد سمٹ آئی ہے جو بورژوازی اور مزدور طبقے کے درمیان چھڑی ہوئی تھی اور جن کی مثالوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ہر ایک انقلابی اتھل پتھل، چاہے اس کا مقصد طبقاتی کشمکش سے بظاہر کتنا ہی دور نظر آتا ہو، بہرحال ناکام ہو کر رہتی ہے جب تک کہ انقلابی مزدور طبقہ فتح یاب نہ ہو جائے، اور ہر ایک سماج سدھار محض یوٹوپیا ہی ہو کر رہ جاتا ہے جب تک کہ پرولتاریہ انقلاب اور جاگیر دارانہ نوعیت کی انقلاب مخالف قوتیں عالمی جنگ میں تلوار سونت کر ایک دوسرے کے سامنے نہ آ جائیں۔ ہمارے سامنے یہ تصویر یوں ابھرتی ہے، جیسی کہ حقیقت میں وہ ہے بھی، کہ بیلجیم اور سوئٹزرلینڈ دونوں اس وسیع تاریخی منظر میں آنسو اور ہنسی کا ملا جلا ایک کارٹونی خاکہ پیش کر دیتے ہیں: بلجیم کی بورژوا شاہی حکومت کے نمونے کی ریاست اور سوئٹزرلینڈ بورژوا ریپبلک کے نمونے کی ریاست، دونوں اپنے حساب سے اس خیال میں مگن کہ طبقاتی جدوجہد سے بھی وہ ایسے ہی بے نیاز ہیں جیسے یورپی انقلاب سے۔ اب جبکہ ہمارے پڑھنے والوں نے دیکھ لیا کہ طبقاتی جدوجہد 1848 میں زبردست سیاسی صورت اختیار کر کے پھیل گئی، وقت آ گیا ہے کہ ہم ان معاشی تعلقات پر قریب سے بحث کریں جن پر بورژوازی کا وجود اور اس کی طبقاتی بنیاد ہے۔

ہم ان کو تین بڑے حصوں میں اس بیان کو پھیلاتے ہیں:

(1) مزدوری کا سرمائے سے تعلق: مزدوروں کی غلامی اور سرمایہ داروں کی حکمرانی

(2) موجودہ نظام میں درمیانے درجے کے بورژوا طبقوں کا اور جنہیں 'عام' کا نام دیا جاتا ہے یعنی ان جاگیروں کا بہرحال تباہ و برباد ہونا

(3) یورپ کی مختلف قوموں کے بورژوا طبقوں کا انگلینڈ کے سامنے جو ساری دنیا کی مارکیٹ پر بے تحاشا حکومت چلاتا ہے، تجارت میں گھٹنے ٹیک دینا اور استحصال کا شکار ہو جانا۔

ہم کوشش کرتے ہیں کہ یہ تمام باتیں نہایت سلیس اور عام فہم انداز میں کہی جائیں یہاں تک کہ سیاسی معاشیات کی جو بنیادی اور ابتدائی معلومات ہیں ان سے بھی یہ سوچ کر نہ گزر جائیں کہ پڑھنے والے کو وہ پہلے سے ہی معلوم ہوں گی، ہم چاہتے ہیں کہ مزدور ہماری بات سمجھ لیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ موجودہ نظام کے مستند حمایتیوں سے لے کر، اشتراکی شعبدہ بازوں اور

علم سیاست کے بے سند اہل کمال تک، جن کے وجود سے یہ ٹکڑوں میں بٹا ہوا جرمنی اپنے "اسلاف اور مورث اعلیٰ رجواڑوں" سے زیادہ مالا مال ہے، نہایت معمولی اور سادہ معاشی تعلقات کے بارے میں ایک حیرت انگیز ناواقفیت عام طور سے پائی جاتی ہے۔ تو اول ہم پہلا سوال لیتے ہیں:

کام کی اجرت کیا ہے؟

اجرت کیسے طے ہوتی ہے؟

اگر مزدوروں سے سوال کیا جائے "تمھاری اجرت کتنی ہے؟" تو ایک جواب دے گا "مجھے مالک سے دن کا ایک مارک ملتا ہے" دوسرا کہے گا "مجھے دو مارک روز کے ملتے ہیں" وغیرہ۔ محنت کی جس شاخ میں وہ کام کرتے ہیں اس کے انداز سے انہیں مختلف اجرتیں ملتی ہیں اور کاروبار کا مالک ایک مقررہ کام پورا ہونے پر ایک مقررہ اجرت انہیں دیتا ہے، مثلاً ایک گز کپڑا بننے کی اتنی اجرت اور ایک صفحہ ٹائپ کمپوز کرنے کی اتنی۔ اگرچہ اجرت پانے والوں کے جواب الگ الگ ہوں گے، تاہم ایک پوائنٹ پر سب میں اتفاق رائے ہوگا کہ اجرت اس رقم کا نام ہے جو کام کے مقررہ وقت کے بدلے یا محنت کے ایک خاص نتیجے کے بدلے سرمایہ دار کی طرف سے دی جاتی ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ سرمایہ دار مزدوروں کی محنت روپیہ دے کر خریدتا ہے۔ یہ لوگ اپنی محنت روپے کے عوض بیچتے ہیں۔ مگر یہ تو محض سامنے کی بات ہوئی۔ اصلیت یہ ہے کہ جو چیز یہ لوگ بیچتے ہیں وہ محنت نہیں بلکہ ان کی محن کی قوت ہے۔ سرمایہ داران سے محن کی قوت ایک دن، ایک ہفتہ یا ایک مہینہ کے لئے خرید لیتا ہے۔ اور جب وہ خرید چکا تو پھر مزدور کو ایک طے شدہ وقت کے لئے کام میں لگا کر اس کا استعمال کرتا ہے۔ جتنی رقم میں سرمایہ دار نے محن کی قوت خریدی ہے، فرض کیجئے دو مارک میں خریدی، تو اتنی ہی رقم میں وہ دو پونڈ شکر بھی خرید سکتا تھا، یا کسی اور مال کی کوئی اور مقدار۔ وہ دو مارک جن میں سرمایہ دار نے دو پونڈ شکر خریدی وہ شکر کی اس مقدار کی قیمت ہوئی۔ اسی طرح وہ دو مارک جن میں 12 گھنٹے کی قوتِ محن کا استعمال خریدا، 12 گھنٹے کی محن کی قیمت ٹھہری۔ لہٰذا محن کی قوت ایک ایسا مال ہوا جو شکر کی طرح ہے۔ نہ اس سے کم نہ زیادہ۔ محن کو گھنٹوں سے ناپا جاتا ہے، شکر کو ترازو سے۔

مزدور اپنی شیعینی قوت محن کا سرمایہ دار کی شیعینی روپے سے تبادلہ کرتے ہیں اور اس تبادلے میں کوئی نہ کوئی ایک نسبت رکھی جاتی ہے۔ اتنے وقت کی قوتِ محن اتنی رقم کے بدلے استعمال کی جائے گی۔ 12 گھنٹے کپڑا بنائی کے دو مارک۔ اب ان دو مارک کا مطلب کیا وہ مال نہیں جو میں دو مارک کے بدلے خرید سکتا ہوں؟ ہر قسم کے مال کے بدلے میں ایک خاص نسبت سے۔ سرمایہ دار نے اسے دو مارک دیئے تو گویا اتنی مقدار گوشت کی، اتنی مقدار کپڑے کی، اتنی ایندھن، اتنی روشنی وغیرہ دے دی، یہ مزدور کے دن بھر کے محن کے بدلے میں۔ اس حساب سے دو مارک اس نسبت کو ظاہر کرتے ہیں جس نسبت سے قوت محن کا تبادلہ ہوا دوسری شے کے ساتھ۔ یہ ہے اس کی قوت محن کی قدر تبادلہ (وہ قدر یا قدر جس پر مال بدلا جا سکے)۔ یہی قدر تبادلہ جب روپے میں شمار ہوتی ہے تو اس شکی قیمت کہلاتی ہے۔ محنکی اجرت یا مزدوری ایک خاص نام ہے جس کے معنی ہوتے ہیں قوت محن کی قیمت۔ عام طور سے اسی کو محن کہتے ہیں۔ یعنی اپنی قسم کے اس ایک ہی مال کی قیمت، جس کا وجود الگ نہیں ہوتا، صرف آدمی کے گوشت پوست میں ہوتا ہے۔

کسی ایک مزدور کو لیجئے، مثلاً بُنکر کو۔ سرمایہ دار اسے سانچہ اور سوت دیتا ہے۔ بُنکر کام پر بیٹھ جاتا ہے اور سوت کا کپڑا بن جاتا ہے۔ سرمایہ دار اس کپڑے کو لے کر بیچ ڈالتا ہے، سمجھئے کہ 20 مارک میں بیچا۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا بُنکر کی اجرت اس کپڑے میں حصہ دار ہے؟ ہرگز نہیں۔ کپڑا ابھی بکا بھی نہیں تھا بلکہ اس کی بنائی بھی پوری نہ ہونے پائی تھی کہ بہت پہلے بننے والے کو اپنی اجرت مل گئی۔ سرمایہ دار اس کو جو اجرت کی رقم دیتا ہے وہ اس کپڑے کی آمدن میں سے نہیں ہوتی بلکہ وہ اس رقم میں ہوتی ہے جو پہلے سے ہی ریزور میں رکھی گئی ہے جس طرح وہ سانچہ اور سوت جو مالک کی طرف سے کام کے لئے دیا گیا ہے، خود بنائی کرنے والے کی محنت کا نتیجہ نہیں ہوتا ٹھیک ایسے ہی وہ مال ہے جو بُنکر کو اپنے مال یعنی محنت کی قوت کے بدلے میں ملتا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ مالک کو کپڑے کا کوئی خریدار ہی نہ ملتا۔ یا اسے اس کی فرخت سے اسے اتنی بھی رقم وصول نہ ہوتی جتنی اجرت میں دی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کپڑا کہیں اچھے داموں بیچ لے۔ بُنکر سے اس معاملے کا کوئی سروکار نہیں۔ سرمایہ دار نے بُنکر کی قوتِ محن کو اسی دولت میں سے، اسی سرمائے میں سے خرچ کر کے خریدا ہے جو پہلے سے جمع تھا۔ اسی طرح جیسے اس نے خام مال خریدا۔ سوت اور کام کے اوزار مثلاً سانچے پر بھی اس کا ایک حصہ خرچ کیا۔ جب وہ ساری خریداری کر چکا اور اسی خریداری میں وہ "قوت محن" بھی شامل ہے جو کپڑا تیار کرانے کے لئے لازمی ہے، تو وہ ایک مال تیار کرتا ہے جس میں خام مال لگا تا ہے اور محنت کے وہ اوزار جو اس کی اپنی ملکیت ہیں۔ محنت کے انہی اوزاروں میں، ظاہر بات ہے کہ یہ بھلا آدمی بُنکر بھی شامل ہے جس کا حصہ تیار مال میں یا مال کی قیمت میں ویسے ہی غائب ہے جیسے سانچے کا حصہ۔

نتیجہ یہ نکلا کہ کام کی اجرت مزدور کا اس شے میں حصہ نہیں ہوتی جو مزدور نے تیار کیے۔ اجرت اس مال کا حصہ ہے جو پہلے سے موجود تھا اور جسے سرمایہ دار اپنے لئے پیداواری قوت محن کی کوئی نہ کوئی مقدار خرید لیتا ہے۔

چنانچہ قوت محنت ایک ایسی شے ٹھہری جو اجرت پر کام کرے والا سرمائے کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔ فروخت کیوں کرتا ہے؟ زندگی بسر کرنے کے لئے۔

لیکن قوت محنت کا عمل میں آنا، یعنی خود محن ہی مزدور کی زندگی کی کارگزاری ہے یہ اس کی اپنی زندگی کا ظہور ہے۔ یہ سرمایہ حیات وہ دوسرے آدمی کے ہاتھ بیچتا ہے تاکہ ضروریات زندگی حاصل کر سکے۔ مطلب یہ کہ اس کی اپنی زندگی کی کارگزاری (جسے ہم نے سرمایہ حیات کہا ہے) محض ایک ذریعہ ہے جو اس کے وجود کو باقی رکھتا ہے۔ کام وہ اس لئے کرتا ہے کہ جی سکے۔ وہ محن کو اپنی زندگی کا ایک حصہ نہیں بلکہ زندگی کی قربانی شمار کرتا ہے۔ محن ایک شیے جو مزدور نے اپنی کارگزاری سے تیار کیا ہے وہ اس کی کارگزاری کا مقصد نہیں ہوتا۔ مزدور خود اپنے لئے نہ تو وہ ریشم تیار کرتا ہے، نہ وہ محل جو اس نے بنا کر کھڑا کیا ہے۔ خود اپنے لئے جو اس نے تیار کیا وہ تو اجرت ہے، رہا ریشم، سونا یا محل وہ اس کے نزدیک ضروریات زندگی کی خاص

مقدار ہے۔ وہ مقدار بھی کیا؛ تعجب نہیں جوروئی کی ایک واسکٹ، تانبے کے چند سکے اور بیٹھی چال کا ایک آدھ کمرہ۔ وہ مزدور جو دن رات میں 12 گھنٹے بنائی کتائی کرتا ہے، برمہ چلاتا ہے ،خراد کرتا ہے، بلڈنگ اٹھاتا ہے، پھاوڑہ چلاتا ہے، پتھر کوٹتا ہے، بوجھ ڈھوتا ہے، وغیرہ وغیرہ، کیا 12 گھنٹوں کے ان محن کے کاموں کو وہ اپنی زندگی کا مظہر شمار کرتا ہے؟ اپنی زندگی سمجھتا ہے ؟نہیں، اس کے برخلاف، زندگی اس کے لئے تب شروع ہوتی ہے جب وہ اس کی کارگزاری سے نمٹتا ہے، اپنے دسترخوان پر پہنچ کر، شام کی تفریح کی جگہ پر، یا اپنے بستر میں۔ غور کیجئے تو یہ 12 گھنٹے کی محنت بنائی، کتائی یا برمہ چلانے کی حیثیت سے کوئی معنی نہیں رکھتی بلکہ ایک کمائی کی حیثیت ہے، جو کمائی دسترخوان تک، تفریح کی جگہ تک اور بستر تک پہنچا دیتی ہے۔ اگر ریشم کے کیڑے کو یہ سمجھ کر تار نکالنا پڑے کہ وہ اس کی بدولت رینگنے کی عمر بسر کر لے تو وہ صحیح معنوں میں اجرت پر کام کرنے والا مزدور ہوگا۔ محن کی قوت ہمیشہ سے ایک مال نہیں تھی۔ محنت ہمیشہ سے بکتی نہیں آئی ہے۔ یعنی محنت کو ہمیشہ سے (خرید و فروخت کی) آزادی نہیں تھی۔ بندہ اپنے آقا کے ہاتھ محن کی قوت فروخت نہیں کرتا، ٹھیک اسی طرح جیسے بیل اپنی خدمات کسان کو نہیں بیچتا۔ بندہ تو اپنی قوت محنت سمیت ایک بار اور ہمیشہ کے لئے آقا کے ہاتھ بک چکا۔ وہ تو ایک مال ہے جو یکے بعد دیگرے مالکوں کے قبضے میں جاتا رہتا ہے۔ وہ بذات خود ایک مال (جنس بازار) ضرور ہے، مگر اس کی قوت محنت اپنے قبضے کی جنس نہیں۔ رعایا یا مزارع اپنی قوت محنت کا صرف ایک حصہ (جزو) ہی بیچتا ہے۔ زمین کے مالک سے اسے اپنی محنت کا صلہ نہیں ملتا، بلکہ اورالٹا زمین کا مالک خود اس سے نذرانہ وصول کیا کرتا ہے۔

مزارع یا رعایا ملکیت ہے اراضی کی_ جو بھی پھل آئے گا، وہ زمین کے مالک کو جائے گا۔ اس کے برخلاف کھلا ہوا مزدور خود اپنے کو بیچتا ہے اور وہ بھی قسطوں میں بیچتا ہے۔ وہ روز کے روز اپنے زندگی کے 8، 10، 12، 15 گھنٹے نیلام کرتا ہے، جو زیادہ بولی دے اسی کو_ خام مال، کام کے اوزار اور زندگی کی ضروریات کے مالک، یعنی سرمایہ دار کو دے ڈالتا ہے۔ مزدور نہ کسی ملک کی ملکیت ہے، نہ زمین کی ملکیت، بلکہ اس کی روزمرہ زندگی کے 8، 10، 12، 15 گھنٹے اس شخص کی ملکیت ہیں جو انہیں خرید لے۔ مزدور کے جب جی میں آتا ہے، جس سرمایہ دار سے پہلے سودا کیا تھا، اسے چھوڑ دیتا ہے اور سرمایہ دار جب مناسب دیکھتا ہے کہ اسے مزدور کے کام سے منافع نہیں ہوتا، یا اتنا منافع نہیں ہوتا جتنا اس نے اندازہ کیا تھا، وہ مزدور کو الگ کر دیتا ہے۔ لیکن مزدور جس کی گزر بسر کا واحد ذریعہ قوت محنت کو بیچنا ہی ہے، خریداروں کے پورے طبقے، یعنی سرمایہ دار طبقے کا دامن نہیں چھوڑ سکتا جب تک کہ وہ بھوک کے مارے اپنی زندگی تج دینے کو تیار نہ ہو جائے۔ وہ کسی ایک یا دوسرے سرمایہ دار کی ملکیت نہیں ہے، بلکہ پورے سرمایہ دار طبقے کی ملکیت ہے، پھر کرنا اس کو یہی ہے کہ اپنا سودا کرے، اسی سرمایہ دار طبقے کے اندر کوئی گاہک تلاش کرے۔

اب یہاں سے، سرمایہ اور مزدوری کے باہمی تعلق کو اور نزدیک سے جانچنے سے پیشتر، ہم فی الحال ان عام تعلقات پر مختصراً نظر ڈالیں گے جو اجرت کا فیصلہ کرنے میں زیر غور آتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا اجرت یا مزدوری دراصل ایک خاص شکی قیمت ہے اور وہ شے ہے قوتِ محن۔ چنانچہ اجرت کے فیصلے پر وہی اصول یا قاعدے لاگو ہوں گے جو اور دوسرے اشیا کی قیمت کا تعین کرتے ہیں۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ شکی قیمت کیسے متعین ہوتی ہے؟

شے کی قیمت کس سے متعین ہوتی ہے؟

خریدار اور بیچنے والے کے درمیان مقابلے سے، مانگ کا جو تعلق سپلائی سے اور سپلائی کا مانگ سے ہوتا ہے اس بنا پر طے ہوتی ہے۔ شے کی قیمت کا تعین جس مقابلے سے کیا جاتا ہے، اس کے تین پہلو ہیں۔ شے ایک ہے اور بیچنے والے کئی ہیں۔ اگر شے کی کوالٹی سب کے یہاں ایک سی ہو تو جو سب سے سستا بیچے گا، دوسرے حریفوں کو میدان سے نکال باہر کرے گا اور بکری میں سب پر حاوی ہو جائے گا۔ چنانچہ شے بیچنے کے لئے، منڈی کے لئے خود بیچنے والوں کے درمیان کھینچا تانی چلتی رہتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنا شے بیچ لے، زیادہ سے زیادہ بیچ لے اور اگر ممکن ہو تو دوسروں کے مقابلے سے ہٹا کر تن تنہا ہی بیچ لے۔ اس کی خاطر وہ اوروں سے قیمت گھٹا کر بیچتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ خود بیچنے والوں کے درمیان مقابلہ چلتا ہے اور یہ مقابلہ اس مال کی قیمت جو وہ منڈی میں لاتے ہیں، گرا دیتا ہے۔

پھر خریداروں میں بھی مقابلے کا بازار گرم ہوتا ہے اور اس مقابلے کے باعث، بازار میں لائی جانے والے اشیا کی قیمت بڑھتی ہے۔

آخر کار بیچنے اور خریدنے والوں کے درمیان مقابلے کی نوبت آتی ہے۔ خریداروں کی کوشش ہوتی ہے کہ کم سے کم داموں پر خریدے، بیچنے والا چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ داموں پر بیچے۔ خریداروں اور بیچنے والوں کے باہمی مقابلے کا نتیجہ اس بات پر ہوتا ہے کہ ان دونوں فریقوں کے درمیان کس طرح کا تعلق ہے_ یعنی یہ مقابلہ خریدنے والوں کی فوج میں زیادہ سخت ہے یا بیچنے والوں کی فوج میں۔ صنعت ان دونوں فوجوں کو ایک دوسرے کے مقابل صف آراء کر دیتی ہے، جن میں سے ہر ایک خود اپنی ہی صفوں سے جنگ کرتا رہتا ہے، اپنی ہی فوج سے لڑتا رہتا ہے، وہ فوج جس کے دستوں میں چھین جھپٹ کم ہو، آخر وہی فوج اپنے حریف پر فتحیاب ہو جاتی ہے:

فرض کیجئے کہ کپاس کی 100 گانٹھیں منڈی میں آتی ہیں اور اس وقت 1000 گانٹھ کے خریدار موجود ہیں۔ ایسی حالت میں بازار کی مانگ مال کی سپلائی سے دس گنی ہے۔ خریداروں میں مقابلہ تیز ہو جائے گا۔ ان میں سے ہر ایک کی کوشش ہوگی کہ کم از کم ایک ورنہ ممکن ہو تو ساری سو کی سو گانٹھیں اپنے ہاتھ میں لے لے۔ یہ مثال کوئی فرضی قیاس آرائی نہیں ہے۔ ایسے دور آتے رہتے ہیں کہ اس صنعت کی تاریخ میں جہاں کپاس کی فصل بگڑی، چند سرمایہ داروں نے مل کر یہ کوشش کی کہ صرف 100 گانٹھیں نہیں بلکہ دنیا بھر کی منڈی سے کپاس کا

سارا اسٹاک خرید ڈالیں۔ چنانچہ یہ جو مثال اوپر دی گئی ہے، اس میں ہر ایک خریدار پوری کوشش کرے گا کہ فی گانٹھ کپاس پر ذرا اونچی بولی دے کر دوسرے خریدار کو میدان سے باہر کر دے۔ کپاس کے بیوپاری، جنہوں نے منڈی میں مال رکھا ہے، جب دیکھتے ہیں کہ دشمن کی فوج میں سخت کٹا چھنی ہو رہی ہے، اور 100 کی 100 گانٹھوں کا سودا پٹ جانا یقینی ہے تو وہ چوکس ہو جائیں گے کہ ان کے درمیان ناچاقی نہ ہونے پائے اور خاص ایسے وقت جبکہ سامنے والوں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر بولی لگانے والا ہے، کپاس کے دام گرنے نہ پائیں۔ اس صورت میں بیچنے والوں کی فوج میں یک دلی ہو جائے گی۔ وہ ایک ہو کر خریداروں کا سامنا کریں گے: فلسفیانہ بے نیازی سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں گے۔ ان کے منہ مانگے داموں کی کوئی انتہا نہ رہے اگر یوں نہ ہو کہ سب سے بڑھ چڑھ کر بولی لگانے والوں کی بولی بھی آخر کہیں نہ کہیں پہنچ کر تھک جاتی ہے۔

بس اگر کسی شیکی سپلائی اس کی مانگ سے کم ہو جائے تو بیچنے والوں کے بیچ تھوڑا سا کیا، بالکل بھی مقابلہ نہیں ہوتا۔ جس نسبت سے بیچنے والوں کے درمیان مقابلہ گھٹتا ہے، اسی نسبت سے خریدنے والوں کے درمیان بڑھتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ کسی شیکے بازار میں کم و بیش تیزی آتی رہتی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ اکثر اوقات اس کے الٹ معاملہ ہوتا ہے اور نتیجہ بھی اس کے الٹ نکلتا ہے۔ منڈی کی مانگ سپلائی کہیں زیادہ رہتی ہے، بیچنے والوں میں جان توڑ مقابلہ ہوتا ہے گاہک کی کمی پڑ جاتی ہے، اور مال کوڑیوں کے مول بکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قیمتوں کا چڑھنا اترنا، تیزی اور مندی کا مطلب کیا ہے؟ خوردبین سے دیکھیں تو ریت کا ایک ذرہ بھی بہت اونچا نظر آتا ہے اور پہاڑ کے مقابلے میں دیکھئے تو مینار کی بلندی بھی پست دکھائی دے گی اور اگر قیمتوں کا تعین سپلائی اور مانگ کے تعلق سے ہی ہوتا ہے تو خود سپلائی اور مانگ کا تعلق کس سے طے ہوتا ہے؟

پہلا بورژوا جو نظر آئے اسی سے ہم یہ سوال کرتے ہیں۔ وہ لمحہ بھر کو سوچے گا نہیں بلکہ سکندر اعظم کی طرح، اس مابعد الطبیعیاتی گرہ (38) کو ہندسی پہاڑوں سے کاٹ کر رکھ دے گا۔ اس کی زبان سے یہ جواب ہوگا کہ میں جس شیکو بیچنا چاہتا ہوں اگر اس میں 100 مارک لاگت آئی ہے اور 110 مارک میں شے بکتی ہے اور اس میں سمجھئے کہ ایک سال لگ جاتا ہے تو میں ایمانداری کا اور خاصا معقول منافع حاصل کر لوں گا۔ لیکن اگر مجھے اس کے بدلے 120 یا 130 مارک ملتے ہوں تو کیا کہنا چاہیے کہ یہ غیر معمولی اور زبردست منافع ہوگا۔ یہاں یہ سوال آتا ہے کہ بورژوا کے نزدیک منافع کا ناپ کیا مقرر ہے؟ شے کی تیاری پر آئی ہوئی لاگت۔ اگر وہ اپنی شے کے بدلے دوسری اشیا کی وہ مقدار پائے جن کی تیاری میں لاگت کم آئی ہے تو وہ گھاٹے میں رہا۔ اور اگر اپنی شے کے بدلے دوسری اشیا کی وہ مقدار وصول کرے جن کی تیاری پر زیادہ لاگت آئی ہے تو وہ فائدے میں رہا۔ منافع کی کمی بیشی کا حساب وہ لگاتا ہے اس بات سے کہ اپنے مال کے بدلے میں جو قدر ہاتھ آئی وہ صفر سے اوپر ہے یا نیچے یعنی اپنیشے کے بدلے کی پیداوار کی لاگت سے کتنی زیادہ ہے، کتنی کم۔

اب یہ بات نظر میں آ گئی ہے کہ مانگ اور سپلائی کے درمیان جو تعلق یا رشتہ ہے اس میں ادل بدل ہونا ہی کبھی قیمتیں چڑھاتا ہے، کبھی اتارتا ہے، کبھی تیزی لاتا ہے، کبھی مندی۔ اگر ایک مال کی قیمت کافی بڑھی ہے، چاہے وہ مال کی سپلائی ناکافی ہونے کے باعث یا مانگ کے اندھا دھند بڑھ جانے کے سبب ہو، بہر حال اس کا بڑھنا بتاتا ہے کہ کسی اور شیکی قیمت ضرور اسی نسبت سے گری ہے، کیوں کہ شیکی قیمت تو رقم کی صورت میں اسی نسبت کو ظاہر کرتی ہے جس نسبت سے دوسری شے بدلے میں وصول ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک گز ریشمی کپڑا لیتے ہیں۔ اگر اس کی قیمت پانچ سے چھ مارک ہوگئی۔ تو چاندی کی قیمت ریشمی کپڑے کے سامنے گر گئی۔ صرف چاندی کی نہیں، دوسرے تمام اشیا بھی جو پہلے کی قیمتوں پر اٹکی رہ گئیں، ریشم کے سامنے ان کے دام گھٹ گئے۔ جسے اتنا ہی ریشمی کپڑا لینا ہو، اب وہ بدلے میں اپنی اشیا کی زیادہ مقدار دے گا۔ اس طرح جب ایک شے کے دام چڑھیں گے تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ صنعت کی اسی شاخ کی طرف، جس کی تیزی ہے، بہت سارا سرمایہ امنڈ پڑے گا اور روپیہ ڈھونے کی یہ دوڑ تب تک جاری رہے گی جب تک سرمائے کی اس چیتی صنعت میں بھی منافع کا اوسط معمول پر نہ آ جائے یا پیداوار ہوتے ہوتے اتنی فالتو نہ ہو جائے کہ قیمت میں سے لاگت بھی نہ نکل سکے۔

اس کے برعکس اگر کسی شیکی قیمت اتنی گر جائے کہ اصل لاگت بھی نہ نکل سکے تو سرمایہ اس مال کی تیاری سے منہ موڑ لیتا ہے۔ سوائے ایسے موقع کے جب کسی صنعت کی کوئی شاخ اپنے زمانے کا تقاضا پورا کرنے کے قابل نہ رہے اور اسے ڈوبنا ہی ہو، باقی ہر حالت میں اس شیکی پیداوار، یعنی اس کی سپلائی سرمائے کے منہ موڑ لینے کے باعث برابر گھٹتی چلی جائے گی یہاں تک کہ وہ بازار کی مانگ کے مطابق ہو جائے اور تب اس کی قیمت پھر سے پیداوار کی لاگت کے ساتھ چلے گی بلکہ سپلائی گھٹتے گھٹتے بازار کی مانگ سے بھی نیچے اتر جائے گی، یعنی وہاں تک گھٹے گی کہ اس کی لاگت کے مقابلے میں قیمت پھر بڑھ جائے گی، یعنی وہاں تک گھٹے گی کہ اس کی لاگت کے مقابلے میں قیمت پھر بڑھ جائے، کیوں کہ شیکی موجودہ قیمت ہمیشہ یا تو لاگت سے اونچی رہتی ہے یا نیچی۔

ہم نے دیکھ لیا کہ سرمایہ صنعت کی ایک شاخ سے دوسری میں لگاتار ڈولتا رہتا ہے۔ قیمتیں چڑھ جائیں تو اس صنعت میں سرمائے کی لہر چڑھ جاتی ہے، قیمتوں کا اتار ہو تو لہر اتر جاتی ہے دوسرے نقطہ نظر سے اس مسئلے کو دیکھیں تو یہ بتایا جا سکتا ہے کہ صرف سپلائی پر نہیں، بلکہ مانگ پر بھی لاگت فیصلہ کن اثر ڈالتی ہے۔ مگر یہ بحث ہمیں نفس مضمون سے دور لے جائے گی۔

ابھی ہم نے دیکھا کہ سپلائی اور مانگ کا یہ اتار چڑھاؤ برابر کسی شیکی قیمت کو اس کی لاگت کی سطح پر لے آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کسی شے کی اصل قیمت ہمیشہ یا تو اس کی لاگت سے اونچی رہتی ہے یا نیچی۔ لیکن قیمتوں کا یہ چڑھنا یا گرانا آپس میں حساب برابر کر لیتا ہے۔ چنانچہ وقت کے ایک خاص دائرے میں اگر صنعت کی ساری مندی تیزی یا چڑھی اتری قیمتوں کی جوڑ جمع کی جائے تو یہ نکلے گا کہ اشیا کا ایک دوسرے سے تبادلہ پیداوار کی لاگت کی بنا پر ہوتا ہے اور یوں قیمت کا فیصلہ لاگت سے کیا جاتا ہے۔

قیمت کا لاگت کے انداز سے طے کیا جانا ان معنوں میں نہیں سمجھنا چاہیے جن میں ماہرین معاشیات نے سمجھا ہے۔ معاشیات والے تو کہتے ہیں کہ شے کی اوسط قیمت اس کی پیداوار کی لاگت کے برابر ہوتی ہے۔ بس یہی ان کے نزدیک قانون یا اصول ہے۔ رہی یہ افراتفری، جس میں قیمتوں کا بڑھنا ان کے گھٹنے سے اور گھٹنا بڑھنے سے برابر ہوتا رہتا ہے، یہ ان

کی رائے میں محض ایک اتفاقی معاملہ یا چانس کی بات ہے۔ اتنا ہی حق یہ کہنے کا بھی ہے، بلکہ معاشیات کے بعض اور ماہرین نے کہا بھی، کہ قیمتوں کا یہ اتار چڑھاؤ ہی قانون یا اصول نظر آتا ہے اور پیداوار کی لاگت سے قیمتوں کا تعین محض ایک اتفاقی بات ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ اسی اتار چڑھاؤ کی لپیٹ میں (اگر زیادہ قریب سے چھان بین کی جائے تو وہ نہایت خوفناک تباہی آتی ہے جو شدید زلزلے کی طرح بورژوا سماج کو جڑ بنیاد سے ہلا ڈالتی ہے) صرف اسی اتار چڑھاؤ کے جھٹکوں میں اسی کی لپیٹ میں یہ ہوتا ہے کہ قیمتیں لاگت کے حساب سے طے کی جائیں۔ اس کی بے قاعدگی کی ساری جوڑ جمع میں ہی اس کا قاعدہ یا بندوبست موجود ہے۔ اس صنعتی افراتفری کی لپیٹ میں، مقابلہ در مقابلہ کے اسی چکر میں، کہنا چاہیے کہ افراط و تفریط (یا ایک انتہا دوسری انتہا کا) حساب برابر کر دیتی ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی مال کی قیمت اس کی لاگت سے طے پاتی ہے مگر اس طور پر کہ ایک وقت میں قیمت اصل لاگت سے اوپر چلی جاتی ہے تو دوسرے وقت میں وہ لاگت سے نیچے اتر آتی ہے اور اس طرح لاگت سے اوپر جا کر یا نیچے اتر کر ایک دوسرے کی تلافی ہو جاتی ہے اور قیمتوں کا لاگت سے تعین ہو جاتا ہے۔ یہ اصول صحیح نہیں بیٹھے گا اگر ہم کسی ایک صنعتی شیکو الگ دیکھیں، یہ تبھی صحیح ہوگا جب کسی صنعت کو مجموعی طور پر نظر رکھیں۔ اسی طرح یہ اصول کسی ایک علیحدہ صنعت کار پر صادق نہیں آتا بلکہ صنعت کاروں کے پورے طبقے کو بیک وقت شمار میں لانا چاہیے۔

قیمت کا لاگت سے طے پانا برابر ہے اس بات کے کہ کسی شے کی تیاری پر جتنا وقت محن لگنا ضروری ہے اس سے قیمت کا طے پانا، کیونکہ لاگت میں دو چیزیں شامل ہوتی ہیں:
(1) کچا مال اور مشینوں اوزاروں کی گھسائی یا ٹوٹ پھوٹ کا خرچ_ یعنی وہ صنعتی مال جن کی پیداوار پر محنت کا ایک وقت لگتا ہے اور جو محنت کے ایک مقررہ وقت کا حاصل ہوتے ہیں، اور
(2) براہ راست محنت، جس کا ناپ بھی وقت سے ہوتا ہے۔

مزدوری کا تعین کس سے ہوتا ہے؟

وہی عام اصول یا قانون جو عام طور سے شیکی قیمت کا تعین کرتے ہیں، اسے گھٹاتے بڑھاتے ہیں، وہی اجرت کا بھی تعین کریں گے جو محنت کی قیمت ہے۔

اجرت یا مزدوری بھی سپلائی اور مانگ کے تعلق سے گھٹے بڑھے گی، قوت محن خریدنے والوں، یعنی سرمایہ داروں اور بیچنے والوں یعنی مزدوروں کے درمیان مقابلہ جیسی صورت اختیار کرے گا، اجرت بھی ویسا ہی رخ لے گی۔ اجرت کی اونچ نیچ اشیا کی قیمت میں عمومی کمی بیشی سے ہم آہنگ ہوگی۔ پھر اسی چڑھاؤ اتار کی حدود کے اندر محن کی قیمت بھی اس کی لاگت سے قرار پائے گی، یعنی محنت کے اس وقت سے جو اس شیکو یعنی محن کی قوت کو تیار کرنے میں لازمی لگتا ہے۔

بس یہیں سے یہ سوال آتا ہے کہ "محن" کی قوت تیار کرنے میں کتنی لاگت آتی ہے؟

اتنی لاگت جتنی مزدور کو بحیثیت مزدور برقرار رکھنے میں اور اسے تیار کر کے مزدور بنانے میں آئے۔

اس لئے کسی کام کو سکھانے میں جتنا کم وقت لگے گا، مزدور کی تیاری کی لاگت بھی اتنی ہی کم آئے گی اور اسی نسبت سے محنت کی قیمت یعنی اجرت بھی کم ٹھہرے گی۔ ان صنعتوں میں جہاں امیدواری یا کام سیکھنے میں کوئی خاص مدت نہیں لگتی، بلکہ مزدور کے محض جسمانی طور پر موجود ہونے سے ہی کام چل جاتا ہے، وہاں مزدور کی تیاری کی لاگت صرف اسی قدر ہوتی ہے جتنے میں وہ زندہ رہے اور محنت کے قابل رہنے کا سامان خرید سکے۔ لہٰذا اس کے محن کی قیمت ان چیزوں کی قیمت سے طے ہو جاتی ہے جو زندگی گزارنے کے لئے نہایت ضروری ہیں۔

یہاں ایک اور صورتحال کا بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ کارخانے کا مالک جب اپنے مال کی لاگت کا حساب لگاتا ہے اور اس کے انداز سے قیمت آنکتا ہے تو مشینوں اوزاروں کی گھسائی اور ٹوٹ پھوٹ کا خرچ بھی اس میں جوڑ لیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مشین 1000 مارک میں آئی ہے اور دس سال کام دینے والی ہے تو وہ 100 مارک سالانہ اپنے مال کی قیمت میں جوڑ لے گا تاکہ جب دس سال ہونے کو آئیں تو وہ اس رقم کی نئی مشین اس کی جگہ چالو کر دے۔ اسی طرح جب سیدھی سیدھی قوتِ محن کی لاگت نکالی جائے تو آگے محنت کرنے کی قوت کی لاگت بھی اس میں ملا لینی چاہیے تاکہ مزدور آگے کی نسل پیدا کر سکے اور تھکے ہوئے مزدور کی جگہ تازہ دم مزدور آتا جائے۔ چنانچہ مزدور کی گھسائی اور ٹوٹ پھوٹ کا بھی ویسے ہی حساب لگایا جاتا ہے جیسے مشینوں اوزاروں کی ٹوٹ پھوٹ کا۔

سادہ قوت محن کی پیداواری لاگت گویا اتنی ہوئی جتنے میں مزدور خود اپنا وجود رکھ سکے اور اپنے جیسے دوسرے مزدور پیدا کرے۔ مزدور کے خود زندہ رہنے اور نیا مزدور تیار کرنے کی یہی قیمت ہے جسے اجرت کہتے ہیں۔ اس طرح جو اجرت متعین کی جاتی ہے وہ کم سے کم اجرت کہلاتی ہے۔ جس طرح شیکی قیمت کا فیصلہ عام طور سے لاگت پر ہوتا ہے (اسے الگ شے کسی ایک مال میں نہیں دیکھا جاتا)، اسی طرح کم سے کم اجرت کا معاملہ کسی ایک مزدور تک محدود نہیں بلکہ عموماً مزدوروں کی قسم کے بارے میں صحیح ہے۔ الگ الگ مزدوروں، لاکھوں کروڑوں مزدور اتنی اجرت نہیں پاتے ہیں کہ خود بھی جئیں اور اولاد بھی پال کر تیار کریں، البتہ پورے مزدور طبقے کی اجرت، سارے اتار چڑھاؤ کے دائرے میں اسی کم سے کم اجرت پر آ کر ٹھہرتی ہے۔ اب جب کہ ہم اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ وہ کون سے اصول یا قانون ہیں جو دوسری اشیا کی قیمت کی طرح اجرت گھٹانے بڑھانے کا بھی فیصلہ کیا کرتے ہیں، ہم اپنے نفس مضمون کے حوالے سے زیادہ نپی تلی بات کر سکتے ہیں۔

سرمائے کی نوعیت اور افزودگی

سرمائے میں کچا مال شامل ہے، آلاتِ محن، اور مختلف ضروریات زندگی، یعنی وہ سب چیزیں جنہیں کام میں لایا جاتا ہے تاکہ نئے کچے مال تیار کئے جائیں، محن کے نئے مشینی اوزار بنائے جائیں اور ضروریات زندگی تیار کی جائیں۔ سرمائے کے یہ سارے اجزاء محن کا حاصل ہیں، محن ہی کی پیداوار ہیں۔ یہ ایک جگہ ذخیرہ کیا ہوا محن ہے۔ ذخیرہ کیا ہوا یہ محن جو آگے کی نئی پیداوار کا ذریعہ بنے گا_ یہ ہے سرمایہ...

معاشیات کے ماہرین یوں فرماتے ہیں:

نیگرو غلام کے کیا معنی ہیں؟ معنی یہ کہ سیاہ نسل کا آدمی، چاہے ایسے کہہ لو، چاہے ویسے، بات ایک ہی ہے۔

نیگرو تو بہرحال نیگرو ہی رہتا ہے۔ کچھ خاص ایسے بندھن ہیں جو اسے غلام بنا لیتے ہیں۔ کپاس کی کتائی مشین بہرحال مشین ہوتی ہے۔ لیکن کچھ بندھن ایسے ہیں کہ وہ کتائی کی مشین سرمایہ بن جاتی ہے۔ بندھن توڑ دیں تو وہ سرمایہ نہ رہے گی، جیسے ان خاص بندھنوں کے بغیر نہ سونا (ایک دھات کے بجائے) رقم رہے گی، نہ شکر میں شکر کی قیمت رہ جائے گی۔

پیداوار کے کام میں لگے ہوئے لوگ صرف قدرت یا فطرت پر ہی اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسرے کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی صورت میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا کر کام کرتے ہیں اور مل کر ایک دوسرے کے کام کا تبادلہ کرتے ہیں۔ کوئی شے تیار کرنے کی خاطر ان کے آپس میں کچھ خاص بندھن یا رشتے قائم ہو جاتے ہیں اور انہی سماجی رشتوں کے اندر بندھ کر وہ فطرت پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اشیا کی پیداوار ہوتی ہے۔

یہی سماجی رشتے، جن میں مال بنانے والے ایک دوسرے کے شریک ہو جاتے ہیں، جن حالات میں ان کا کام ایک دوسرے سے ہاتھ بدلتا ہے اور پیداوار کے پورے عمل میں ان کی شرکت ہوتی ہے، وہ بھی ذرائع پیداوار کی حیثیت یا نوعیت کے مطابق ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوا کرتے ہیں۔ جب کبھی جنگی کاروائی کا کوئی نیا پرزہ نیا ہتھیار ایجاد ہوا ہے تو فوج کی پوری اندرونی ترتیب لازمی طور سے بدل گئی ہے۔ وہ رشتہ جس کی بدولت الگ الگ افراد مل کر ایک فوج بنتے ہیں اور ایک فوج کی طرح کام کرتے ہیں وہ بھی کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں اور فوجوں کی ایک دوسری سے نسبت میں بھی بڑا فرق آ گیا ہے۔

چنانچہ وہ سماجی تعلقات جن میں رہ کر افراد کچھ مال تیار کرتے ہیں، یا یوں کہیے، سماجی پیداواری تعلقات بدل جاتے ہیں، پیداوار کے مادی ذریعوں کی تبدیلی اور ترقی کے ساتھ، پیداواری طاقتوں کے تغیر و تبدل کے ساتھ ان کی شکل بھی بدل جاتی ہے۔ پیداواری تعلقات کا یہی کل مجموعہ ہے جسے سماجی تعلقات کا نام دیا جاتا ہے، یہی سوسائٹی کہلاتا ہے، یہی سارے تعلقات مل کر ایسے سماج کی شکل اختیار کرتے ہیں، جو تاریخی رفتار کے ایک خاص مرحلے پر پایا جاتا ہے، جو اپنا ایک خاص کردار رکھتا ہے۔ زمانہ قدیم کا سماج، جاگیرداری سماج، بورژوا (سرمایہ دارانہ) سماج کا مطلب ہے اسی قسم کے پیداواری تعلقات کا کل مجموعہ، جو ایک خاص شکل رکھتا ہے اور انسانی تاریخ کے ایک خاص مرحلے کا پتہ دیتا ہے۔

سرمایہ بھی پیداوار کا ایک سماجی تعلق ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ تعلق ہے پیداوار کا، جو بورژوا سماج کی دین ہے، یہ جو ضروریات زندگی ہیں، آلات محن ہیں، کچا مال ہے، سب مل ملا کر سرمایہ بنتے ہیں۔ کیا یہ کسی خاص سماجی حالات کے ماتحت کسی مقررہ سماجی بندھنوں کے سائے میں تیار اور ذخیرہ نہیں ہوتے ہیں؟ نئی پیداوار کے لئے ان کو جو کام میں لایا جاتا ہے تو کیا کسی خاص سماجی حالات، کسی مقررہ سماجی رشتوں کے بغیر ایسا ہوتا ہے؟ کیا یہی وہ سماجی کردار نہیں ہے جو نئی پیداوار کے کام میں لگنے والے تیار شدہ سامان کو سرمائے میں تبدیل کر دیتا یا سرمایہ بنا دیتا ہے؟

سرمایہ صرف ضروریات زندگی، محن کے اوزار اور کچے مال یا محض مادی سامان تک محدود نہیں ہوتا۔ ان سب کے علاوہ ایک اور چیز بھی سرمائے میں شامل ہے، اور وہ ہے قدر مبادلہ۔ تمام تیار شدہ سامان جن میں سرمایہ لگا ہو، وہ مال ہیں۔ حاصل یہ کہ سرمایہ صرف مادی سامان کا ہی اجماع نہیں بلکہ ساری کی ساری اشیا بھی، ان کی قدر مبادلہ بھی اور سماجی مرتبے بھی سرمایہ ہی ہیں۔ اب چاہے ہم اون کی جگہ روئی رکھ دیں، گیہوں کی جگہ چاول، ریلوے کی جگہ پانی کے جہاز، سرمایہ بہرصورت سرمایہ ہی رہے گا بشرطیکہ کہ روئی، چاول اور پانی کے جہاز، جو سرمائے کی ٹھوس شکل ہیں، ان کی ایکسچینج قدر وہی رہے، قیمت وہی رہے جو پہلے والے اون، گیہوں اور ریلوے میں موجود تھی۔ سرمائے کی جس شکل میں تجسیم ہوتئ ہے، چاہے جتنی بدلتی رہے، سرمائے میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

یہ ضرور ہے کہ ہر ایک سرمایہ تو اشیا کی مجموعی مقدار ہوتا ہے یعنی مبادلے کی تمام قدروں کا مجموعہ۔ لیکن اشیا کی ہر کوئی مجموعی مقدار یا مبادلے کی ساری قدریں مل کر سرمایہ نہیں ہوتا۔

کیسی بھی ہوں، لیکن مبادلے کی قدریں مل کر مبادلے کی ایک قدر یا بنتی ہیں اور ہر ایک الگ الگ قدرِ مبادلہ بھی مبادلے کی قدروں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک مکان کی حیثیت 1000 مارک کی ہے تو اس مکان کی قدر مبادلہ 1000 مارک ہوئی، کاغذ کا کوئی پرزہ ایک پفینگ (پیسے) کا آتا ہے تو اس کی ایکسچینج قدر وہی ہوئی $\frac{100}{100}$ پفینگ۔ وہ سامان جو دوسرے سامان سے بدلا جا سکے وہ ہے شے۔ وہ بھاؤ یا تناسب جس پر اشیا بدلی جاتی ہیں ، وہ ہے ان کی قدرِ مبادلہ، یا اگر روپے کی شکل دیکھو تو وہ ہے ان کی قیمت۔ ان اشیا کی مقدار چاہے کتنی ہو، اس خصوصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ وہ ہوتی ہیں اشیا ہی، ان میں بہرحال قدرِ مبادلہ پائی جاتی ہے یا یہ کہ اپنی ایک مقررہ قیمت رکھتے ہیں۔ درخت بڑا ہو یا چھوٹا ہے بہرحال درخت ہی۔ لوہا ایکشیہے جسے ہم دوسرے سامان سے بدلتے ہیں، چاہے اونس کے وزن سے بدلیں یا ہنڈرڈ ویٹ سے، اس کے شیہونے میں یا قدرِ مبادلہ ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جتنی اس شیکی مقدار ہوگی، اسی انداز سے قدرِ مبادلہ کم یا زیادہ ہو جائے گی، اس کی قیمت کم یا زیادہ شمار ہوگی۔

اچھا تو اشیا کی کوئی مجموعی مقدار، قدرِ مبادلہ کی کوئی مقدار سرمایہ کیسے بنتی ہے؟

وہ بذات خود ایک سماجی طاقت کی حیثیت میں سرمایہ بنتی ہے، یعنی ایسی طاقت کی حیثیت میں جو سماج کے ایک حصے ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے؛ براہ راست جیتی جاگتی قوت محن سے مبادلے میں آ کر وہ باقی بھی رہتی ہے اور بڑھتی بھی جاتی ہے۔ ایک ایسے طبقے کا وجود ہونا جس کے پاس صرف محن کی سکت ہو اور کچھ نہیں، بس سرمائے کی وہی ایک لازمی شرط ہے۔ براہ راست جیتی جاگتی محن پر جو پہلے کی ذخیرہ کی ہوئی اور ایک ٹھوس روپ میں سمٹی ہوئی محن کا غلبہ ہو جاتا ہے، وہی اس ذخیرہ کی ہوئی محن کو سرمایہ بنا دیتا ہے۔

سرمائے کی اصلیت اس میں نہیں ہے کہ ذخیرہ کی ہوئی محن جیتی جاگتی محن کی خدمت میں لگ کر نئی پیداوار کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ سرمائے کی اصلیت تو اس میں ہے کہ جیتی جاگتی محن ذخیرہ کی ہوئی محن کی خدمت میں لگ کر اسی کی قدر مبادلہ باقی رکھنے اور بڑھانے کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے۔

اجرتی مزدور کا سرمائے سے تعلق

سرمایہ داروں اور مزدوری پر کام کرنے والوں کے درمیان تبادلے میں ہوتا کیا ہے؟

تبادلہ یوں ہوتا کہ مزدور اپنی قوت محن کے بدلے میں ضروریات زندگی وصول کرتا ہے اور سرمایہ دار ان ضروریات زندگی کے بدلے میں محنلیتا ہے، مزدور کی پیداواری کارگزاری وصول کرتا ہے، وہ تخلیقی طاقت لیتا ہے کہ جتنی مزدور کے استعمال میں آ گئی، صرف اسی کی کمی پوری نہیں کرتا بلکہ ذخیرہ کی ہوئی محنت (سرمائے) کو اس سے کچھ زیادہ "قدر" دے نکلتا ہے جتنی پہلے سے موجود تھی۔ ضروریات زندگی کی جو چیزیں مہیا ہوئی ہیں، صرف انہی کا ایک حصہ مزدور کو سرمایہ دار کی طرف سے وصول ہوتا ہے۔ یہ حصہ اس کے کس کام آیا؟ اس کام کہ ملتے ہی استعمال میں آ گیا۔ ضروریات زندگی کی یہ چیزیں ایک بار میں نے استعمال کر لیں تو پھر میرے لئے ان کا وجود عدم برابر ہو گیا بشرطیکہ کہ اسی وقت میں جب کہ میں ان کا استعمال کر رہا تھا، ان کے سہارے جی رہا تھا، ضروریات زندگی کا اور ایسا سامان تیار نہ کر لوں، اپنی محنت کے بل پر اور ایسی "قدر ز" نہ نکال لوں جو استعمال کے دوران کھپ جانے والی قدروں کی کمی پوری کر دیں۔ لیکن کھپ جانے والی قدر کی جگہ دوسری "قدریں" پیدا کرانے کا یہی کارخیر ہے، جس کی قوت ایک مزدور ضروریات زندگی کی چیزوں کے بدلے سرمایہ دار کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور خود اس سے کورا رہ جاتا ہے۔

یہاں ایک مثال لیتے ہیں: کاشتکار اپنے کھیت مزدور کو دن بھر کام پر چاندی کے پانچ روپے دیتا ہے۔ ان پانچ روپوں کے عوض کھیت مزدور سارے دن کاشتکار کے کھیت پر کام کرتا ہے اور اس صورت میں چاندی کے دس روپوں کی آمدنی کراتا ہے۔ کاشتکار نے جو "قدر" دی اس کی کمی تو پوری کر ہی لی، اتنا ہی اور وصول کیا۔ چنانچہ یہ پانچ روپے جو اس نے کھیت مزدور کو دیئے ہیں، اس طرح کام میں لگائے کہ ان سے کام بھی بنا، منافع بھی۔ ان پانچ روپوں ہی سے اس نے کھیت مزدور کی محنت اور طاقت خریدی جو دوگنی "قدر" کی زراعتی پیداوار دیتی ہیں اور چاندی کے پانچ روپوں کو دس میں تبدیل کرتی ہیں۔ کھیت مزدور نے اپنی اس پیداواری طاقت کے بدلے میں، جس کی کارگزاری کاشت کار کے حوالے کر دی تھی، چاندی کے پانچ روپے پائے جو وہ ضروریات زندگی کے بدلے میں خرچے گا اور جلد یا بدیر ان کو استعمال کر کے نمٹا دے گا۔ تو معلوم ہوا کہ چاندی کے یہ پانچ روپے دو طریقوں سے استعمال ہوئے _ پیداواری اور ناپیداواری۔ سرمائے نے اسے محنت کی اس قوت (اس مقام پر لفظ "محنت کی قوت" (لیبر پاور) اینگلز کا بڑھایا ہوا نہیں بلکہ اس اصل نسخے میں موجود تھا جسے مارکس نے Neue Rheinische Zeitung میں شائع کیا۔ ایڈیٹر) کے بدلے خرچ کیا جو چاندی کے دس روپے دیتی ہے، یہ تھا پیداواری طریقہ۔ اور مزدور کے لئے وہ ناپیداواری طریقہ تھا، کیوں کہ اس نے ضروریات زندگی کے بدلے میں خرچ کر دیئے اور وہ ہمیشہ کے لئے اس کے ہاتھ سے گئے، ان کی "قدر" پھر سے صرف اسی صورت میں حاصل کر سکتا ہے جب کاشتکار کے ساتھ پھر وہی تبادلے کا عمل دہرائے۔ حاصل یہ کہ سرمائے کے لئے مزدوری (یعنی اجرتی محنت) کا موجود ہونا شرط ہے اور مزدوری کے لئے سرمائے کا موجود ہونا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے مشروط ہیں اور باہم ایک دوسرے کو جنم دیتے رہتے ہیں۔

کسی سوتی مل میں مزدور کیا محض سوتی کپڑا تیار کرتا ہے؟ نہیں وہ سرمایہ تیار کرتا ہے۔ وہ ایسی قدریں پیدا کرتا ہے جو پھر اسی کے محن پر حکم چلانے کے کام آتی ہیں اور اسی محن سے آگے چل کر نئی قدریں پیدا کراتی ہیں۔ سرمایہ خود کو صرف محن کی قوت کے بدلے میں بڑھاتا ہے، صرف اس صورت میں کہ اجرتی محن میں جان ڈالے (اسے کام میں لگائے)۔ مزدوری پر کام کرنے والے کی قوت محن سرمائے سے ہی بدلی جا سکتی ہے بشرطیکہ کہ وہ سرمائے کو بڑھاتی ہو، یعنی اس طاقت کو اور بڑھاتی ہو جس کی وہ غلام ہو چکی ہے۔ لہٰذا سرمائے کا بڑھنا پرولتاریہ کا، مزدور طبقے کا بڑھنا ہے۔

مطلب یہ کہ سرمایہ داروں کے اور مزدوروں کے مفاد ایک ہی ہیں _ یوں فرماتے ہیں بورژوا اور ان کے ماہرین معاشیات۔ واقعی؛ مزدور ہلاک ہو جائے اگر سرمایہ اسے کام نہ دے۔ اور سرمایہ ڈوب جائے اگر وہ "محن" کی قوت سے فائدہ نہ اٹھائے، اور فائدہ اٹھانے کی خاطر اس کا خرید لینا ضروری ہے۔ وہ سرمایہ جو پیداوار کے کام کے لئے رکھا جاتا ہے، وہ پیداواری سرمایہ جتنی تیزی سے بڑھے گا، اتنی ہی زیادہ صنعت پھلے پھولے گی۔ (سرمایہ دار طبقہ) جتنا زیادہ مالدار ہو گا اور کام خوب چلے گا، سرمایہ دار کو اتنی ہی زیادہ مزدوروں کی ضرورت پڑے گی، اور مزدور خود کو اتنے ہی مہنگے داموں بیچے گا۔

نتیجہ نکلا کہ مزدوروں کے لئے گوارہ صورت حال کی یہی ایک لازمی شرط ہے کہ جتنا بھی ممکن ہو پیداواری سرمایہ تیزی سے بڑھتا چلا جائے۔

لیکن یہ پیداواری سرمائے کا بڑھنا دراصل ہے کیا؟ یہ ہے جیتے جاگتے محن پر ذخیرہ کئے ہوئے محنت کا غلبہ بڑھ جانا۔ یہ ہے مزدور طبقے پر بورژوازی کے اقتدار کا چھا جانا۔ اگر اجرتی محن غیر کے لئے وہ دولت پیدا کرتا ہے جو خود اسی پر حکم چلائے ، وہ طاقت پیدا کرتا ہے جو اس سے دشمنی باندھے ہوئے ہے یعنی سرمایہ تو اسی سرمائے سے مزدور کو روزگار بھی (Beschaftigungsmittl) ملتا ہے، یا یوں کہو، زندگی بسر کرنے کے ذریعے نصیب ہوتے ہیں، اس شرط کے ساتھ کہ وہ خود کو پھر نئے سرے سے سرمائے کا حصہ بنائے ، ایسا لیور بنائے جو پھر سرمائے کو تیزی سے بڑھنے والے چکر میں لگا دے۔

اس نقطہ پر زور دینا کہ سرمائے اور مزدوروں کے مفاد ایک ہی ہیں، اصل میں یہ کہنا ہے کہ سرمایہ اور مزدوری یہ دونوں ایک ہی تعلق کے دو پہلو ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے دم سے قائم ہیں ٹھیک اسی طرح جیسے سود خور مہاجن اور مفلس وقلاش باہم وابستہ ہوتے ہیں۔

جس وقت تک اجرت پر کام کرنے والا مزدور، مزدوری پر رہتا ہے، اس کی تقدیر کا آسرا سرمائے پر رہتا ہے۔ یہی ہے وہ بدنام زمانہ مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان مفادات کا اشتراک ہے۔

اگر سرمایہ بڑھتا ہے تو اجرتی محنت کا ذخیرہ، مزدوری پر محنت کرنے والوں کا ہجوم بڑھتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیں گے کہ سرمائے کی حکمرانی لوگوں کی اور بڑی تعداد پر پھیلتی ہے۔ اس کی ایک خوش گوار حالت فرض کر لیں کہ پیداواری سرمائے کے بڑھنے سے "محن" کی مانگ بڑھتی ہے اور محن کی قیمت یعنی مزدوری بڑھ جاتی ہے۔

کوئی مکان چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو لیکن جب تک اردگرد کے مکان اسی کی طرح چھوٹے ہیں اس وقت تک رہن سہن کا سماجی تقاضا اس سے پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کہیں اس چھوٹے سے مکان کے قریب کوئی محل کھڑا ہو گیا تو وہی مکان دب کر، سمٹ کر نہایت تنگ جھونپڑی رہ جاتا ہے۔ اب اسی مکان کا چھوٹا سا رہ جانا صرف اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یا تو مالک مکان بے نیاز ہے یا اس کی ضرورتیں نہایت محدود ہیں۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس چھوٹے سے مکان کا سائز چاہے کتنا ہی بڑا ہو جائے لیکن اگر وہ قریبی محل بھی اسی رفتار سے بڑھا، یا کچھ اور بھی بڑھ گیا تو نسبتاً چھوٹ مکان کے رہنے والے اپنی چار دیواری میں خود کو اور بھی سمٹا محسوس ہوا کریں گے، انہیں اور بھی کوفت اور ذلت کا احساس ہوگا۔

اجرت کے کسی قدر بڑھ جانے کے ساتھ ہی پیداواری سرمائے کا تیزی سے بڑھ جانا لگا ہوا ہے۔ اور پیداواری سرمائے کے تیزی سے بڑھ جانے کا تقاضا ہے کہ اسی حساب سے دولت بھی بڑھے، عیش وعشرت بھی بڑھے، سماج کی طلب بھی بڑھے اور اس کی آسائشیں بھی بڑھ جائیں۔ اس طرح سے خواہ مزدوروں کو نصیب ہونے والی راحتیں بھی بڑھی ہوں تاہم وہ سماجی چین آرام جس تک ان کی پہنچ ہوگی، اس کی حیثیت گر جائے گی کیونکہ سامنے سرمایہ داروں کو کہیں زیادہ عیش وآسائش میسر ہوگا جس تک مزدوروں کی دسترس نہ ہونے پائے گی اور یوں بھی سماج کی ترقی کی نسبت سے مزدوروں کی راحت کم ہی رہے گی۔ ہماری طلب اور راحت دونوں ہی سوسائٹی سے پیدا ہوتی ہیں، اس لئے ہم سوسائٹی کے پیمانے سے انہیں ناپتے ہیں، ان چیزوں سے نہیں ناپتے جو دل کی تسلی کے لئے کافی ہوں۔ ہماری طلب اور ہماری راحتیں دونوں سماجی کردار رکھتی ہیں، ان کی حیثیت اضافی ہے (قطعی نہیں ہے)۔

کام کی اجرت عموماً صرف اس سے طے نہیں ہوتی کہ بدلے میں اشیا کی کتنی مقدار مجھے وصول ہوئی۔ کام کی اجرت کے اندر کئی ایک رشتے پائے جاتے ہیں۔

سب سے اول تو یہ ہے کہ مزدور کو اپنی قوت محن کے بدلے ایک مقررہ رقم ملتی ہے۔ سوال ہے کہ کیا صرف اسی نقد رقم سے اس کی اجرت کا فیصلہ ہوتا ہے؟

16 ویں صدی میں یورپ میں سونے چاندی کی جو مقدار گردش کر رہی تھی، بہت بڑھ گئی کیونکہ پتہ چلا کہ امریکہ کی کانوں میں سونا چاندی بھرا پڑا ہے اور زر آسانی سے ہاتھ آنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس کی بدولت یورپ میں دوسری اشیا کے مقابلہ میں سونے چاندی کی قدر گر گئی۔ مزدوروں کو اپنی قوت محنت کے بدلے چاندی کے سکوں میں اتنی ہی رقم ملتی رہی جتنی پہلے ملتی تھی۔ ان کے محن کی قیمت رقم میں تو اتنی ہی رہی لیکن ان کی کمائی گر گئی کیونکہ اتنی ہی رقم کے بدلے میں اب دوسری اشیا کی کم مقدار ملتی تھی۔ یہ بھی ایک سبب تھا جس کی بدولت 16 ویں صدی میں سرمایہ کافی بڑھا اور بورژوازی کو عروج حاصل ہوا۔

ایک اور واقعہ لیتے ہیں: 1847 کی سردیوں میں فصل خراب ہونے کے باعث ضروریات زندگی کی سب سے اہم چیزیں یعنی اناج، گوشت، مکھن، پنیر وغیرہ کی قیمتوں میں بہت تیزی آ گئی۔ فرض کیجئے مزدوروں کی اپنی قوت محنت کے بدلے اتنی ہی رقم ملتی رہی جتنی پہلے ملا کرتی تھی۔ تو کیا ان کی اجرت کم نہیں ہوگئی؟ یقیناً گھٹ گئی۔ اتنی رقم کے بدلے میں اب انہیں اناج، گوشت وغیرہ کی مقدار کم ملنے لگی۔ اس بار ان کی اجرت کٹنے کا سبب یہ نہیں تھا کہ چاندی قدر کم ہوگئی بلکہ ضروریات زندگی کے سامان کی "قدر" بڑھ گئی۔

آخر میں اب یہ فرض کریں کہ محنت کی قیمت جو نقدی میں ملتی تھی وہ جوں کی توں رہتی ہے لیکن زمین اور مشین سے تیار ہونے والے مال کی قیمتیں گر جاتی ہیں، چاہے وہ نئی مشینوں کے لگ جانے سے گریں یا فصل بہت اچھی ہو جانے کی یا کسی اور وجہ سے گریں۔ اب مزدور اتنی ہی رقم میں ہر قسم کا مال زیادہ خرید سکتے ہیں۔ چنانچہ اس بار ان کی اجرت صرف اس لئے بڑھ گئی کہ نقدی میں اس کی "قدر" جوں کی توں باقی ہے۔

معلوم ہوا کہ نقدی کی صورت میں جو محنت کی قیمت ملتی ہے، جو نام کی اجرت ہے، وہ اصلی اجرت کے عین مطابق نہیں ہوا کرتی۔ یعنی اشیا کی جتنی مقدار اجرت کے بدلے میں وصول ہوتی ہے اس سے یہ رقم والی اجرت میل نہیں کھاتی۔ اس لئے جب مزدوری یا اجرت کے بڑھنے یا گرنے کی بات آئے تو ہمیں نظر میں رکھنا چاہیے کہ مطلب صرف اس نقد رقم سے نہیں ہے جو محن کے بدلے دی جاتی ہے، یہ نام کی اجرت ہے۔

لیکن چاہے نام کی اجرت ہو، یعنی وہ نقد رقم جس کی خاطر مزدور خود کو سرمایہ دار کے ہاتھ بیچتا ہے، یا اصلی اجرت ہو، یعنی اشیا کی وہ مقدار جو اس نقد رقم سے خریدی جا سکے، دونوں سے وہ رشتے پوری طرح ظاہر نہیں ہوتے جو اجرت میں پوشیدہ ہیں۔ اس کے علاوہ مقدم یہ ہے کہ اجرت اس تعلق سے بھی طے ہوتی ہے جو اجرت کو سیٹھ یا سرمایہ دار کے منافع سے ہوتا ہے۔ یہ

ہوئی اضافی یا تقابلی اجرت۔

اصلی اجرت یہ ظاہر کرتی ہے کہ محنت کی قیمت دوسرے مالوں کے مقابلے میں کتنی ہوئی۔اضافی یا تقابلی اجرت محنت کی پیدا کی ہوئی "قدر" کے اس حصے کو ظاہر کرتی ہے جو براہ راست محنت کو وصول ہوا بمقابلہ "قدر" کے اس حصے کے جو ذخیرہ کی ہوئی محنت یعنی سرمائے کو حاصل ہوا۔

اجرت اور منافع میں کمی بیشی کا عمومی اصول

اور پیچھے ہم کہہ چکے ہیں کہ " کام کی اجرت اس شیمیں جو مزدور نے تیار کی ہے، مزدور کا حصہ نہیں ہوتی۔اجرت ایک حصہ (جزو) ہے اس شیکا جو پہلے سے موجود تھا اور جس کے بدلے میں سرمایہ دار اپنے لئے پیداواری قوت محن کی کوئی نہ کوئی مقدار خرید لیتا ہے"۔اب دیکھئے کہ سرمایہ دار اس دی ہوئی اجرت یا مزدوری کو اس سامان کی فروخت کی رقم میں سے نکالتا ہے جو سامان مزدور نے تیار کیا تھا۔اجرت کو فروخت کی رقم میں سے اس طرح نکالنا ہوگا کہ جیسا کہ قاعدہ ہے، سرمایہ دار کو جتنی لاگت آئی ہے، اس کے اوپر سے کچھ بچے، کچھ منافع ملے۔مزدور نے جو مال تیار کیا ہے، اس کی فروخت کی رقم سرمایہ دار کے نزدیک تین حصے رکھتی ہے:

پہلا حصہ ان قیمتوں کا پورا کرنا جو وہ کچے مال میں پیشگی لگا چکا۔انہی کے ساتھ مشینوں اوزاروں اور کام کے دوسرے سامان کا خرچ، گھسائی، ٹوٹ پھوٹ اور جو بھی رقم ان میں پیشگی لگ چکی ہے۔

دوسرا حصہ وہ رقم جو اجرت میں پہلے دی جا چکی ہے (یا اس مد میں الگ کی جا چکی) اور

تیسرا حصہ جو اوپر سے بچ رہے یعنی سرمایہ دار کا منافع۔

اگر فروخت کی رقم کا پہلا حصہ صرف ان قدروں کو پورا پڑتا ہے جو پہلے سے موجود تھیں، تو ظاہر بات ہے کہ باقی کے دونوں حصے یعنی اجرت اور منافع اس نئی قدر سے نکالے جاتے ہیں جو مزدور کی محنت نے پیدا کی ہے اور جسے کچے مال کی قدر میں جوڑ دیا ہے۔انہی معنوں میں ایک کا دوسرے سے مقابلہ یا موازنہ کرنے کی خاطر ہم یہ کرتے ہیں کہ اجرت اور منافع دونوں کو مزدور کے تیار کئے ہوئے مال کا حصہ قرار دیں۔

اصلی اجرت ممکن ہے جوں کی توں رہے، ممکن ہے بڑھ جائے، تب بھی یہ ہوسکتا ہے کہ تقابلی اجرت گر جائے۔مثال کے طور پر فرض کریں کہ تمام ضروریات زندگی کی قیمتیں دو تہائی گر گئیں اور روزانہ اجرت صرف ایک تہائی کم ہوئی، یا یوں کہہ لیجئے کہ تین مارک ملتے تھے اب دو رہ گئے۔اگرچہ (قیمتوں کے گر جانے کی بدولت) اب مزدور دو مارک میں اس سے زیادہ مال خرید سکتا ہے جتنا وہ تین مارک میں خریدا کرتا تھا، مگر پھر بھی اس کی اجرت سرمایہ دار کے منافع کے مقابلے میں گری ہے۔سرمایہ دار یا کارخانے کے مالک کا منافع ایک مارک بڑھا ہے، دوسرے لفظوں میں، مزدور کو سرمایہ دار سے جو اجرت ملتی ہے یا کہنا چاہیے کہ قدر ہائے مبادلہ وصول ہوتی ہیں اب ان کی کم مقدار کے عوض مزدور کے پہلے سے زیادہ ہی قدرِ مبادلہ زیادہ پیدا کرنی پڑیں گی۔محنت کو جتنا حصہ ملا، سرمائے کو اس سے زیادہ حصہ وصول ہوگیا۔سرمائے اور محنت کے درمیان سماجی دولت کی تقسیم میں اور بھی زیادہ نابرابری ہوگئی۔اسی پہلے والے سرمائے کی بدولت اب محنت کی اور زیادہ مقدار پر سرمایہ دار کا غلبہ ہونے لگا۔مزدور طبقے پر سرمایہ دار طبقے کی حکمرانی اور بڑھ گئی۔مزدور کی سماجی پوزیشن پہلے سے بھی بدتر ہوگئی، وہ سرمایہ دار کی پوزیشن کے سامنے ایک سیڑھی اور اتر گیا۔

تو پھر وہ کون سا عام قانون ہے جو اجرت اور منافع کے ایک دوسرے کے سامنے اتار چڑھاؤ کا فیصلہ کرتا ہے؟

اجرت اور منافع ایک دوسرے کے سامنے الٹی سمت کو چلتے ہیں۔سرمائے کا حصہ یعنی منافع اسی نسبت سے بڑھتا ہے جس نسبت سے محنت کا حصہ، روزانہ اجرت گھٹتی ہے اور یہی گھٹنا بڑھنا دوسری سمت میں بھی ہے۔منافع اتنا بڑھتا ہے جتنی اجرت گھٹتی ہے اور منافع اتنا گھٹتا ہے جتنی اجرت بڑھ جاتی ہے۔

اس پر اعتراض یہ ہوگا کہ سرمایہ دار جو منافع کماتا ہے وہ اپنی پیداوار کو دوسرے سرمایہ داروں کی پیداوار کے بدلے فائدے سے نکال کر کماتا ہے، یا اس وجہ سے کہ نئی مارکیٹیں کھل جاتی ہیں، یا اس سبب سے کہ پرانی منڈی میں اسی پیداوار کی نکاسی اچانک بڑھ جاتی ہے، اس کے مال کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ان سب باتوں کی وجہ سے ایک سرمایہ دار دوسرے سرمایہ داروں کی چوٹ پر منافع لے جاتا ہے، اجرت کے گھٹنے بڑھنے سے، قوت محنت کی قدر مبادلہ کے اتار چڑھاؤ سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔کسی سرمایہ دار کا منافع اس لئے بھی بڑھ سکتا ہے کہ محنت کے اوزار مشین میں بہتری ہوگئی اور قدرتی ذرائع کو زیادہ سلیقے سے استعمال کیا جانے لگا۔

اول تو یہ ماننا ہوگا کہ چاہے الٹے رخ سے دیکھئے، نتیجہ وہی رہتا ہے۔مان لیا کہ منافع اس لئے نہیں بڑھ گیا کہ اجرتیں گر گئی ہیں لیکن اجرتیں اس لئے گری ہیں کہ منافع بڑھ گیا۔دوسروں کی محنت کی اتنی ہی مقدار کے بدلے سرمایہ دار نے مبادلے کی قدروں کی زیادہ مقدار خرید لی لیکن اس پر بھی محنت کو مہنگے داموں نہیں لیا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ سرمایہ دار کو وہ محنت جس سے کھرا منافع وصول ہوا ہے، نسبتاً سستی پڑی۔

اسی سلسلے میں یہ جتا دیا جائے کہ مال کی قیمتوں میں چاہے کتنی ہی تیزی یا مندی آیا کرے، ہر ایک مال کی اوسط قیمت یعنی وہ نسبت جس پر دوسرے مالوں کی ساتھ تبادلہ کیا جاتا ہے، وہ بہرحال اس کی لاگت سے ہی طے ہوتی ہے۔چنانچہ سرمایہ دار طبقے میں اگر ایک سرمایہ دار دوسرے کی چوٹ پر منافع لے جائے تو پھر آخر میں وہ برابر ہی چھوٹتے ہیں۔مشینری میں بہتری

ہو جائے یا پیداوار کے کام میں قدرتی ذرائع کو زیادہ سلیقے سے لگایا جائے تو اس کی بدولت ایک مقررہ وقت میں محنت اور سرمائے کی اتنی ہی مقدار سے، پہلے کی بہ نسبت زیادہ سامان تیار ہونے لگتا ہے۔لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ قدر مبادلہ بھی زیادہ وصول ہوگی۔اگر کتائی کی نئی جینگ مشین لگا کر ایک گھنٹے کے اندر میں پہلے سے دوگنا سوت کات لیتا ہوں (مثلاً پہلے 50 پونڈ سوت تھا اور اب 100 پونڈ سوت کات کر رکھ دیتا ہوں) تو کچھ آگے چل کر مجھے 100 پونڈ سوت کے بدلے میں اوسطاً مال کی اتنی ہی مقدار ملنے لگے گی جتنی پہلے 50 پونڈ کے بدلے ملا کرتی تھی کیوں کہ اب اس کی لاگت آدھی ہوگئی ہے یا کیوں کہ میں اب اتنی ہی لاگت میں دوگنا سامان دے سکتا ہوں۔

آخر میں یہ نتیجہ نکلا کہ سرمایہ دار طبقہ، بورژوازی، چاہے وہ ایک ملک کی ہو، چاہے ساری دنیا کی منڈی کی اور چاہے جس تناسب سے وہ پیداوار کا کھرا منافع اپنے اندر بانٹ لے،اس منافع کا کل جوڑ جمع بہرحال وہی مقدار ہوگی جو ذخیرہ کی ہوئی محنت میں براہ راست محنت نے مجموعی طور سے بڑھائی ہے۔منافع کی کل جوڑ جمع اسی نسبت سے بڑھتی ہے جس نسبت سے محنت سرمائے کو بڑھاتی ہے، یعنی جس نسبت سے اجرت کے مقابلے میں منافع بڑھ جاتا ہے۔

سرمائے اور اجرتی مزدور کے مفادات یکسر متضاد ہیں۔

پیداواری سرمائے میں اضافے کا اجرت پر اثر۔

ہم نے دیکھ لیا کہ سرمائے اور مزدوری کے رشتے کی حدوں میں رہتے ہوئے بھی نظر ڈالئے تو سرمائے اور مزدوری (اجرتی محنت) کے مفاد ایک دوسرے کے بالکل برخلاف جاتے ہیں۔

سرمائے کا تیزی سے بڑھنا برابر ہے اس بات کے کہ منافع تیزی سے بڑھا۔اور منافع تیزی سے صرف اس صورت میں بڑھ سکتا ہے کہ محنت کی قیمت یعنی تقابلی اجرت اسی تیزی سے گھٹے۔یہ تقابلی اجرت اس صورت میں بھی گر سکتی ہے جب کہ نام کی اجرت یعنی محنت کی نقد رقم بڑھنے کے ساتھ ساتھ اصلی اجرت بھی بڑھ جائے، بشرطیکہ اصلی اجرت اتنی نہ بڑھی ہو جتنا منافع بڑھا ہے۔مثال کے طور پر ایسے وقت جب کاروبار مزے میں چل رہا ہو اجرت پانچ فیصدی بڑھتی ہے اور منافع تیس فیصدی، تب یہ تقابلی اجرت بڑھی نہیں بلکہ اور گھٹ گئی۔

اس طرح سے، اگر مزدور کی آمدنی سرمائے کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ بڑھ جاتی ہے تو وہ سماجی خلیج بھی اسی کے ساتھ اور چوڑی ہو جاتی ہے جو مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان موجود ہے اور پھر ساتھ ساتھ محن پر سرمائے کی حکمرانی بھی بڑھ جاتی ہے اور محن کا سرمائے کے رحم و کرم پر جینا بھی۔

یہ کہنا کہ مزدور کا فائدہ اسی میں ہے کہ سرمایہ تیزی سے بڑھے، دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ: مزدور جتنی تیزی سے غیر کی دولت بڑھاتا ہے، اتنے ہی چپڑی روٹی کے زیادہ ٹکڑے اس کے آگے ڈالے جاتے ہیں، اتنے ہی زیادہ مزدوروں کو روزگار میسر آتا ہے اور ان کے وجود کی ضرورت پڑتی ہے اور اتنی ہی زیادہ ان غلاموں کی تعداد بڑھتی ہے جو سرمائے کے رحم و کرم پر جیتے ہیں۔

اس بحث کا حاصل یہ ہوا کہ:

مزدور طبقے کے لئے جو بہتر صورت حال ہو سکتی ہے، سرمائے کا تیزی سے بڑھنا، وہ بھی چاہے مزدوروں کی گزر اوقات کی حالت کتنی ہی اچھی کر دے، لیکن اس ٹکراؤ کو دور نہیں کر سکتی جو بورژوازی یا سرمایہ دار کے مفادوں اور مزدور کے مفادوں میں پایا جاتا ہے۔منافع اور اجرت پہلے کی طرح یہاں بھی ایک دوسرے کے خلاف سمتوں میں چلتے ہیں۔

اگر سرمایہ تیزی سے بڑھے تو اجرت بھی بڑھ سکتی ہے۔لیکن سرمایہ دار کا منافع بڑھنے کی رفتار کہیں زیادہ تیز ہوتی ہے۔مزدور کی مادی حالت کچھ سدھری لیکن یہ سدھرنا اس کی سماجی حالت گر جانے کے دم سے ہوا ہے۔وہ سماجی خلیج جو اسے سرمایہ دار سے دور رکھتی تھی، وہ اور چوڑی ہوگئی۔

آخر میں یہ کہ:

اس بات پر زور دینا کہ پیداواری سرمائے کا زیادہ سے زیادہ تیزی سے بڑھنا اجرتی محنت کے لئے بہتر مواقع فراہم کرتا ہے، دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ مزدور طبقہ جتنی تیزی سے اپنے دشمن کی طاقت اور تعداد بڑھائے، اپنے اوپر حکم چلانے والی غیر کی دولت کے بڑھائے، اتنے ہی عمدہ مواقع فراہم ہوتے ہیں اس بات کے کہ وہ پھر سے محنت کرے، سرمایہ دار کی دولت میں اور اضافہ کرے اور سرمائے کی حکمرانی کو اور اوپر تک لے جائے_ کام کئے جائے اور اسی میں مگن رہے کہ اپنے ہاتھوں وہ سنہری زنجیریں گھڑ رہا ہے جن میں سرمایہ دار اسے جکڑ کر اپنے پیچھے گھسیٹے گا۔

کیا واقعی پیداواری سرمائے کا بڑھنا اور اجرت کا بڑھنا دونوں ایک دوسرے سے بالکل جڑے ہوئے ہیں جیسا کہ بورژوازی کے ماہرین معاشیات ہمیں بتاتے ہیں؟ ہم ان کے کہنے کو نہیں مانتے۔ہم یہ بھی نہیں مانتے کہ سرمائے پر جتنی چربی چڑھے گی اتنا ہی وہ اپنے فرماں بردار ناز برداری کرے گا۔بورژوازی کافی ہوشیار ہے، حساب کتاب پر بہت نظر رکھتی ہے، وہ ان جاگیرداروں کے پھیر میں نہیں پڑنے والی جو نوکر چاکر کے ٹھاٹھ سے اپنی شان جتایا کرتے ہیں۔بورژوازی کے حالات زندگی ہی ایسے ہیں کہ اسے حساب کتاب پر بہت نظر رکھنی پڑتی ہے۔

اسی لئے ضروری ہے کہ ہم اس سوال کی تہہ میں اتریں کہ: پیداواری سرمائے کا بڑھنا اجرت پر کیوں کر اثر ڈالتا ہے؟

سرمائے کی بڑھوتری کس انداز میں اجرت پر اثر انداز ہوتی ہے؟

اگر بورژوا سماج کا پیداواری سرمایہ مجموعی حیثیت سے بڑھتا ہے تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ محنت اور بھی کئی پہلوؤں سے ذخیرہ کی گئی۔ سرمایہ داروں کی تعداد بھی بڑھتی ہے اور ان کے سرمائے کا پھیلاؤ بھی۔ سرمایوں کے بڑھ جانے سے سرمایہ داروں کے درمیان مقابلے کی گرما گرمی ہو جاتی ہے۔ سرمائے کا پھیلاؤ بڑھنا یہ امکان پیدا کرتا ہے کہ وہ مزدوروں کی زیادہ طاقتور فوج کو صنعت کے میدان کارزار میں نکال لائے ایسی فوج جس کے پاس مقابلے کے زیادہ زبردست ہتھیار ہوتے ہیں۔

ایک سرمایہ دار دوسرے کو میدان سے نکال باہر کر سکتا ہے اور اس کے سرمائے پر بھی ہاتھ صاف کر دیتا ہے، بشرطیکہ کہ اس کے مقابلے میں سستا بیچتا ہو۔ مصیبت میں پڑے بغیر سستا بیچنے کے لئے اسے مال سستا بنانا چاہیے یعنی جہاں تک بن پڑے محنت کی پیداواری قوت کو بڑھانا چاہیے۔ محنت کی پیداواری قوت بڑھانے میں سب سے مقدم یہ ہے کہ محنت کی زیادہ تقسیم کی جائے، مشینری کا ہر ایک پہلو سے استعمال بھی ہو اور مستقل اس کی بہتری بھی ہوتی رہے۔ مزدوروں کی فوج جتنی زیادہ ہوگی کہ اسی کے اندر محن کی تقسیم ہوتی ہے، اتنا ہی بڑا وہ پیمانہ ہوگا جس پر مشین سے کام لینا ہے اور اسی نسبت سے پیداواری لاگت برابر کم ہوتی جائے گی۔ محنت اتنی ہی زیادہ پیداوار دیتی جائے گی۔ اسی لئے سرمایہ داروں کے درمیان ہر پہلو سے مقابلہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ محنت کی تقسیم زیادہ سے زیادہ ہو، مشینوں کی تعداد بڑھے اور ان مشینوں کو زیادہ بڑے پیمانے پر کام میں لایا جائے۔ اب اگر محنت کی زیادہ تقسیم کر کے، نئی مشینری کا استعمال کر کے اور ان کو ترقی دے کر، قدرتی ذرائع کو زیادہ نفع بخش اور وسیع طور پر کام میں لا کر کسی سرمایہ دار کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ محنت کی اتنی ہی مقدار میں یا ذخیرہ کی ہوئی اتنی محنت میں زیادہ سامان تیار کر لے، اپنے حریفوں سے زیادہ مال پیدا کر لے، مثلاً جتنے وقت محنت میں اس کے مدمقابل آدھ گز کپڑا بناتے ہیں، وہ ایک گز تیار کر لے تو پھر یہ سرمایہ دار کیسے قدم اٹھائے گا؟

وہ اب بھی پہلے کی طرح آدھ گز کپڑا مارکیٹ کی اسی پرانی قیمت پر بیچ سکتا ہے، لیکن ایسا کرے تو نہ وہ اپنے حریفوں کو میدان سے نکال سکتا ہے، اور نہ اپنے مال کی نکاسی بڑھا سکتا ہے۔ اتنے میں جس نسبت سے اس کی پیداوار بڑھی، اسی نسبت سے بیچنے کی ضرورت بھی بڑھ گئی۔ پیداوار کے زیادہ مہنگے اور زیادہ طاقتور ذریعے، جو اس نے کام میں لگائے، انہی کی بدولت درحقیقت وہ اس قابل ہوا کہ اپنا مال کم قیمت پر نکالے اور وہی اسے مجبور کرتے ہیں کہ پہلے سے زیادہ مال بیچے تاکہ مال کی کھپت کیلئے زیادہ بڑے بازار پر حاوی ہو سکے۔ نتیجہ یہ کہ وہ سرمایہ دار اپنے آدھ گز کپڑے کو حریفوں کے مقابلے میں کم قیمت پر بیچتا ہے۔

اگرچہ پورے ایک گز کپڑی کی تیاری اس سرمایہ دار کو آدھ گز کپڑا بنانے والوں کے مقابلے میں کچھ مہنگی نہیں پڑی، تاہم وہ اس پورے گز کو ہرگز اس قیمت پر بیچنے کے لئے آمادہ نہیں ہوگا جس پر حریف آدھ گز کپڑا بیچ رہے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرنے لگے تو اوپر سے کوئی بچت نہ ہو بلکہ صرف لاگت واپس ملے۔ اب اگر اس کی آمدنی بڑھتی ہے تو صرف اس لئے بڑھی کہ زیادہ سرمایہ کام میں لگا دیا ہے، اس وجہ سے نہیں بڑھی کہ اس کے سرمائے نے دوسرے سرمایوں کے مقابلے میں زیادہ "قدر" کمالی۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر وہ اپنے مال کے دام دوسرے حریفوں سے صرف چند فیصدی کم کر کے رکھتا ہے تو اپنی مراد پوری کر لیتا ہے۔ قیمتیں (بازاری بھاؤ سے) گھٹا کر وہ اپنے سامنے والوں پر بازار تنگ کر دیتا ہے، یا کم از کم ان کی مارکیٹ کا ایک حصہ توڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور آخر میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ چالو قیمت (بازاری بھاؤ) ہمیشہ یا تو لاگت سے اوپر ہوتی ہے یا نیچے، دارومدار اس بات پر ہے کہ صنعت کا بازار کیسا جا رہا ہے، گرم یا نرم۔ اب جس سرمایہ دار نے پیداوار کے زیادہ مفید مطلب اور نئے ذریعے کام میں لئے ہیں، وہ اپنا ماصل لاگت سے کتنے فیصدی بڑھا کر بیچے اس میں فرق پڑے گا اور یہ طے کرنا منحصر ہوگا اس پر کہ آیا فی گز کپڑے کا بازار بھاؤ تب تک کی عام لاگت سے اونچا جا رہا ہے، یا نیچا۔

بہرحال اس سرمایہ دار کی یہ اونچی پوزیشن بہت زمانے تک نہیں چلتی۔ سامنے کے دوسرے سرمایہ دار بھی وہی مشینیں لگا دیں گے، محنت کی تقسیم ویسی ہی یا اس سے بھی بڑے پیمانے پر کر دیں گے اور یہ سلسلہ اتنا عام ہو جائے گا کہ کپڑے کی قیمت نہ صرف پرانی بلکہ نئی لاگتوں سے بھی نیچے اتر جائے گی۔

چنانچہ سرمایہ دار باہم اس حالت میں پہنچ جاتے ہیں جس میں وہ پیداوار کے نئے اختیار کرنے سے پہلے تھے۔ اور اگر ان ذریعوں کے اختیار کرنے کی بدولت پچھلی قیمت پر پہلے سے دوگنا مال دینے کے قابل ہوئے تھے تو اب وہ مجبور ہوتے ہیں کہ پہلے سے بھی کم قیمت پر مال کی دوگنی مقدار کی نکاسی کریں۔ نئی لاگتوں کے حساب سے وہی کھیل کا چکر پھر چل پڑتا ہے۔ محنت کی اور زیادہ تقسیم اور زیادہ مشینری، محنت کی تقسیم اور مشینری سے اور زیادہ بڑے پیمانے پر کام لینا۔ پھر مقابلہ در مقابلہ، پھر اسی نتیجے کی جوابی کاروائی کا سلسلہ چھڑتا ہے۔

سرمایہ دارانہ مقابلے کے اثرات

ہم نے دیکھ لیا کہ کس طرح سے پیداوار کے طریق اور پیداوار کے ذرائع لگاتار نئے سانچوں میں ڈھلتے ہیں اور انقلاب سے گزرتے رہتے ہیں، کس طرح محنت کی تقسیم لازمی طور پر اور زیادہ تقسیم در تقسیم کی طرف لے جاتی ہے، مشینری کا استعمال مشین کے اور زیادہ وسیع استعمال کو لاتا ہے اور بڑے پیمانے کی پیداوار اس سے بھی زیادہ بڑے پیمانے کی پیداوار کو اپنی لپیٹ میں لاتی ہے۔

یہ ہے وہ قانون جو بار بار نئے سرے سے سرمایہ دارانہ پیداوار کو اس کے پرانے کھانچے سے نکال دیتا ہے اور سرمائے کو مجبور کرتا ہے کہ وہ محنت کی پیداواری

طاقت کو تیزی سے دوڑائے کیوں کہ اس نے ان طاقتوں کو پہلے بھی دوڑایا تھا۔ یہ ہے وہ قانون جو سرمائے کو دم بھر چین نہیں لینے دیتا اور برابر اس کے کان میں پھونکتا رہتا ہے کہ _"ابھی اور، ابھی اور آگے"۔

یہ خاص وہی قانون ہے جو کاروبار میں تیزی مندی کے دائرے میں رہ کر مال کی قیمت کو، چاہے کچھ ہو، لیکن مال کی لاگت کے برابر لے آتا ہے۔

کوئی سرمایہ دار چاہے کتنا ہی زبردست پیداوار کے ذرائع میدان میں کیوں نہ اتار لائے لیکن (سرمایہ داروں کے آپس کا) مقابلہ ان ذریعوں کو عام کرتا جائے گا اور جیسے ہی وہ عام ہوں گے، اپنے سرمائے کا پہلے سے بھی زیادہ فائدہ اٹھانے کا واحد نتیجہ یہ ہوگا کہ اب اسے اتنی ہی قیمت میں پہلے سے دس بیس یا سو گنا مال دینا چاہیے۔ بہت ہی گرے ہوئے بھاؤ کو پورا پڑنے کے لئے چونکہ اسے غالباً پہلے سے ہزار گنا مال بیچنا ہوگا تا کہ مال کی زیادہ نکاسی کی جائے اور اب فروخت کا زیادہ پھیلاؤ ضروری بھی ہوگا صرف منافع کمانے کا خاطر نہیں، بلکہ لاگت کا حساب برابر کرنے کے لئے بھی یہ ضروری ہوگا۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، پیداوار کی نکاسی اس لئے بھی ضروری ہو جاتی ہے کہ یہ نہ صرف اس ایک سرمایہ دار کے لئے بلکہ اس کے حریفوں کے لئے بھی زندگی اور موت کا سوال بن جاتا ہے، تو پھر وہی پرانی کش مکش، پیداوار کے نئے ذریعے جتنے زیادہ کارآمد ہوتے ہیں، اتنی ہی شدت سے شروع ہو جاتی ہے۔ محنت کی تقسیم اور مشینری کا استعمال نئے سرے سے اور کہیں بڑے پیمانے پر برابر جاری رہتا ہے۔

پیداوار کے جو ذریعے کام میں لگائے جاتے ہیں وہ چاہے کتنے ہی زبردست کیوں نہ ہوں، مقابلے کا سارا زور اس پر ہوتا ہے کہ مال کی قیمت کو لاگت تک پہنچا کر سونے کا وہ انڈہ سرمائے سے چھین لے جو پیداوار کے زبردست ذریعوں نے اسے دیا ہے۔ یعنی اتنی ہی مجموعی قیمت میں اسے سامان کی زیادہ بڑی مقدار سپلائی کرنی پڑے، یہ ایسا قانون ہے جو وہاں تک اثر دکھاتا ہے جہاں تک پیداوار کو سستا کیا جا سکے، یا یوں کہیے کہ محنت کی اتنی ہی مقدار میں اس سے زیادہ پیدا کیا جا سکے۔ چنانچہ سرمایہ دار کو اپنی ساری بھاگ دوڑ سے سوا اس کے کچھ حاصل ہونے والا نہیں کہ وہ اتنے ہی وقت میں محنت میں زیادہ مال سپلائی کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے، مطلب یہ کہ سرمائے کی "قدر" بڑھانے کی شرطیں اب اور زیادہ سخت ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ سرمایہ داروں کے درمیان مقابلہ لاگت اور قیمت کے تناسب کا قانون لئے ہوئے برابر سرمایہ دار کا پیچھا کرتا رہتا ہے اور وہ جو بھی ہتھیار اپنے حریفوں کے مقابلے کے لئے تیار کرتا ہے، وہ الٹ کر اسی کے لگتا ہے۔ سرمایہ دار مسلسل اس کوشش میں رہتا ہے کہ نئی مشینری لگا کر، جس کا خرچ زیادہ سہی، تاہم مال کی لاگت کم ہو جائے، محنت کے پرانے ڈھچر کی جگہ نئی تقسیم لا کر، مقابلے کی نفسا نفسی نئی تدبیروں کو نکما کرے وہ انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا رہتا۔

اب ہم ذرا تصور کریں کہ یہ بیتابی اور سرسامی حالت تمام دنیا کی منڈی پر چھا جاتی ہے تو ہماری سمجھ میں آ جائے گا کہ سرمائے کا بڑھنا، اس کا ذخیرہ ہونا اور چند ہاتھوں میں سمٹ جانا ادھر لے جاتا ہے کہ محنت کی تقسیم، نئی مشینری کا لگنا اور پرانی کا ترقی دیا جانا لگاتار جاری رہے، ہر پچھلا قدم آگے پڑے اور یہ عمل پہلے سے کہیں زیادہ زبردست پیمانے پر ہوتا رہے۔

یہ اسباب جو پیداواری سرمائے کے بڑھنے کے دم کے ساتھ لگے ہیں، یہ اجرت کے فیصلے پر کس طرح اثر ڈالتے ہیں؟

محنت کی جتنی زیادہ تقسیم ہوگی وہ ایک مزدور کو پانچ یا دس یا بیس مزدوروں کا کام کرنے کا موقع دیتی جائے گی۔ لہٰذا اس کی بدولت خود مزدوروں میں بھی مقابلہ پانچ یا دس یا بیس گنا ہوتا جائے گا۔ مزدوروں میں جو مقابلہ ہوتا ہے وہ صرف اسی میں نہیں کہ کون اپنے آپ کو دوسرے سے سستا بیچے، بلکہ اس میں بھی کہ کون مزدور پانچ یا دس یا بیس کا کام کر کے دکھاتا ہے۔ محنت کی تقسیم جو سرمائے کی لائی ہوئی اور لگاتار اسی کے ہاتھوں بڑھائی ہوئی ہے وہ مزدوروں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ بھی ایک دوسرے سے ایسا مقابلہ کریں۔

جیسے جیسے محنت کی تقسیم بڑھتی جاتی ہے، محنت کا کام سادہ ہوتا جاتا ہے۔ مزدور کی خاص ہنرمندی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اب اسے نہ شدید جسمانی مشقت سے کام لینا ہے نہ دماغی قابلیت سے بلکہ وہ ایک سادہ سی پیداواری طاقت ہو کر رہ جاتا ہے جسے برابر ایک ہی کام کرتے رہنا ہے۔ اب اس کی "محن" ایسی ہے جو کوئی بھی انجام دے سکتا ہے۔ اب اس پر بھی ہر طرف سے مقابلے کے کام کرنے والے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہاں پڑھنے والوں کو (پہلے کا یہ نقطہ) ذہن میں رکھنا چاہیے کہ کوئی "محن" جتنی عام فہم یا سیکھنے میں آسان ہوگی، اس پر ہاتھ بٹھانے کی لاگت جتنی کم ہو جائے گی اتنی ہی اس کی اجرت بھی گھٹ جائے گی کیونکہ ہر ایک مال کی قیمت کی طرح اجرت کا فیصلہ بھی اس کی لاگت سے ہوتا ہے۔

نتیجہ یہ کہ محنت جتنی کم اطمینان بخش ہوتی جائے گی، جتنی اکتاہٹ پیدا کرنے والی ہوگی، اتنا ہی مزدور کے درمیان مقابلہ بڑھے گا اور اجرت کم ہوگی۔ مزدوروں کی کوشش ہوتی ہے کہ اجرت کی رقم میں جو کمی ہوئی ہے اسے وہ زیادہ کام سے پورا کرے، چاہے زیادہ وقت دے کر، چاہے اتنے وقت میں زیادہ مال تیار کر کے۔ اپنی ضروریات کے ہاتھوں وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ محنت کی تقسیم کی بری تاثیر کو اور بڑھا دے۔ انجام یہ کہ جتنا زیادہ وہ کام کرتا ہے اجرت اتنی ہی کم وصول ہوتی ہے۔ اور چونکہ وہ جتنا زیادہ کام دیتا ہے، اتنا ہی زیادہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں سے مقابلہ بڑھاتا جاتا ہے اور ان کو اپنا حریف یا مدمقابل بنا لیتا ہے ایسے مدمقابل جو خود بھی اسی کی طرح انہی بری شرطوں پر اپنے آپ کو پیش کرنے لگتے ہیں۔ اس سیدھے اور صاف سبب سے نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ مزدور خود اپنے وجود سے مقابلے پر اتر آتا ہے، مزدور طبقے کے ایک فرد کی حیثیت سے خود اپنا حریف بن جاتا ہے۔

مشینوں کی تاثیر بھی یہی ہے لیکن کافی بڑے پیمانے پر۔ مشینری ہنرمند مزدور کو ہٹا کر کم یا بے ہنر کو، مرد کی جگہ عورت کو، بڑے کی جگہ بچے کو لگا دیتی ہے۔ جہاں نئی ایجاد کی مشینری آتی ہے وہاں ہاتھ کے کاریگروں کی بڑی تعداد مارے مارے پھرنے پر مجبور کی جاتی ہے اور جہاں پرانی مشینری کو بہتر بنا کر اس کی پیداواری طاقت بڑھا کر کام لیا جاتا ہے وہاں مزدوروں کی الگ الگ ٹکڑیاں الگ کر دی جاتی ہیں۔ سرمایہ داروں کی درمیان جو صنعتی جنگ چلتی ہے، اس کا ایک سرسری خاکہ ہم اوپر دے چکے ہیں۔ اس جنگ کی ایک عجیب خاصیت یہ ہے کہ یہاں مزدوروں کی فوج بھرتی کر کے جیت اتنی نہیں ہوتی جتنی اس فوج کو نکال کر ہوتی ہے۔ اس جنگ کے سپہ سالار یعنی سرمایہ دار ایک دوسرے سے مقابلہ اس میں کرتے ہیں کہ کون زیادہ صنعتی سپاہی نکال باہر کرتا ہے۔

سچ ہے کہ ماہرین معاشیات ہمیں بتاتے ہیں کہ مشینوں کی بدولت جو مزدور ایک جگہ فالتو ہو جاتے ہیں وہ صنعت کی دوسری شاخوں میں کام سے لگ جاتے ہیں۔

یہ حضرات صاف بات کہنے کی جرات نہیں کرتے کہ محنت کی نئی شاخوں میں وہی مزدور کام پاتے ہیں جن کو دوسری جگہ سے نکالا گیا تھا۔ اصلیت چیخ چیخ کر اس جھوٹ کا پول کھول رہی ہے۔ انہیں دراصل کہنا یہ تھا کہ روزگار کے جو نئے ذریعے کھلتے ہیں وہ مزدور طبقے کے دوسرے پرتوں کے لئے کھلتے ہیں، مثلاً مزدوروں کی نوجوان نسل کے اس حصے کے لئے جو صنعت کی اسی شاخ میں کام کرنے کے لئے کھڑا ہوا تھا جس کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بے روزگار ہو جانے والے مزدور کے لئے یہ بھی ایک تسکین ہے۔ سرمایہ دار حضرات کو فائدہ اٹھانے کے لئے کبھی تازہ رگ پٹھے اور جوان خون کی کمی نہیں پڑتی۔ وہ مرنے والوں کے کفن دفن کا انتظام کر دیتے ہیں۔ اور مزدوروں کو تسلی دینے کی بجائے کم از کم اس طرح اپنے دل کی تسلی کر لیتے ہیں۔ اگر مشینری کی بدولت کہیں مزدوری کرنے والے سارے طبقے کا صفایا کرنا پڑ جاتا تو یہ سرمائے کیلئے کیسی ہیبت ناک بات ہوتی کیوں کہ اجرتی محن کے بغیر خود وہ بھی سرمایہ نہ رہتا۔

آئے فرض کریں کہ وہ مزدور، جن کا روزگار مشینوں نے چھین لیا اور نئی نسل کا وہ پورا حصہ جو خاص اسی روزگار کی تاک میں تھا، دونوں یہ نیا روزگار پا لیتے ہیں۔ کیا یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ نئے کام کی اجرت اتنی ہی اونچی رہے گی جتنی پہلے والے کی تھی؟ اس سے تو معاشیات کے سارے قانون کٹ جاتے ہیں۔ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ نئی سے نئی صنعت پہلے کے پیچیدہ اور اونچے درجے کے کام کی جگہ کو ہمیشہ سادہ اور نیچے درجے کے کام سے بھر دیتی ہے۔

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ مزدوروں کہ وہ بہت بڑی تعداد جو مشینری کی بدولت صنعت کی ایک شاخ سے نکالی گئی ہے دوسری شاخ میں کھپ جائے اور اس میں پہلے سے کم اور بدتر اجرت نہ ہو؟

جو مزدور خود مشینوں کے بنانے پر کام کرتے ہیں، ان کی مثال دی جاتی ہے گویا وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ صنعت میں جیسے جیسے نئی مشین کی مانگ بڑھتی ہے اور وہ لگائی جاتی ہے تو مشینیں اور ساتھ ہی مشین سازی بھی قطعی طور پر بڑھ جاتی ہے، جو مزدور مشین سازی کی صنعت میں تھے ان کے لئے روزگار بڑھتا ہے۔ جو مزدور اس شاخ میں لگے ہوئے ہیں، ان کیلئے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہنر مند ہی نہیں، تعلیم یافتہ بھی ہوتے ہیں

پہلے بھی اس دعوے میں آدھی سچائی تھی، اب 1840 کے بعد سے تو اس کا رہا سہا بھرم بھی کھل گیا کیونکہ خود مشین سازی صنعت میں بھی کئی اقسام کی ایسی بہت زیادہ مشینیں لگائی جا رہی ہیں جیسا کہ سوتی دھاگے کے بنانے میں۔ اور جو مزدور مشین سازی کے کام میں ہیں اب ان کے لئے بھی نہایت مکمل مشینوں پر نہایت ناقص مشینوں کا سا کام کرنا رہ گیا ہے۔

لیکن ایک مرد مزدور کی جگہ جسے مشین نے نکالا ہے، فیکٹری اب تین بچوں اور ایک عورت کو کام دیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک مرد کی مزدوری اب تک تین بچوں اور ایک بیوی کا پیٹ پالنے کے لئے کافی نہیں رہی تھی؟ کیا کم سے کم اجرت ایک نسل کو باقی رکھنے اور اسے آگے پھیلانے کو پوری نہیں پڑتی؟ اس صورت میں بورژوازی کے یہ پسندیدہ جملے کیا ظاہر کرتے ہیں؟ صرف ایک بات ثابت کرتے ہیں کہ: ایک مزدور کنبے کا پیٹ پالنے کے لئے جہاں پہلے ایک کی محنت کافی تھی اب وہاں چار کی محنت لگتی ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ: پیداواری سرمایہ جتنا بڑھتا ہے اسی قدر محنت کی تقسیم اور مشینری کے استعمال میں وسعت ہوتی جاتی ہے محنت میں جتنی تقسیم در تقسیم ہوگی اور مشین جتنی زیادہ لگے گی، مزدوروں کے درمیان مقابلہ بھی اتنا ہی کڑا ہوتا جائے گا اور ان کی اجرت اتنی ہی سکڑتی جائے گی۔

اسی ضمن میں یہ کہنا ہے کہ سوسائٹی کے اوپر والی صفوں سے آنے والے بھی مزدور طبقے میں بھرتی ہوتے ہیں۔ بہت سے چھوٹے موٹے کرخندار، معمولی حیثیت کے کاروباری اور کچھ لوگ جو اپنے سرمائے کے سود پر گزارہ کرتے تھے، پرولتاری صفوں میں آ کر مل جاتے ہیں کہ اب ان کے سامنے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہتا کہ جہاں مزدور کا ہاتھ اٹھتا ہے وہیں اپنا ہاتھ اٹھائیں۔ اس طرح سے ہاتھوں کا وہ جنگل جو روزگار مانگنے کے لئے اٹھا ہے اور گھنا ہو جاتا ہے اور بازو پہلے سے بھی زیادہ سوکھ جاتے ہیں۔ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ چھوٹا

کارخانہ دار ایسے مقابلے میں دیر تک نہیں ٹھہر سکتا جس کی پہلی شرط ہوتی ہے کہ پیداوار زیادہ سے زیادہ بڑے پیمانے پر چلتی رہے یعنی جسکے لئے لازمی ہے بڑے سے بڑا صنعت کار ہو چھوٹے کی سمائی نہیں۔

وضاحت کے بغیر یہ بھی ظاہر ہے کہ سرمائے پر جو فیصدی ملتا ہے وہ بھی سرمایہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتا چلا جاتا ہے، سرمائے کی جتنی بھاری مقدار اور تعداد بڑھتی ہے، اس پر فیصدی منافع اتنا ہی گھٹتا ہے۔ اس لئے چھوٹی حیثیت کے کاروباری کو اپنے سرمائے کی فیصد پر جینا مشکل ہو جاتا ہے، وہ بھی صنعت کا رخ کرتا ہے یعنی چھوٹے صنعت کاروں کی صفوں میں سما جاتا ہے اور ساتھ ہی پرولتاریہ میں شامل ہونے والے امیدواروں کی لائن میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

آخری بات یہ کہ اوپر بیان کی ہوئی تبدیلیاں جتنا جتنا سرمایہ داروں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ پیداوار کے ان زبردست ذریعوں کو جو وجود میں آ چکے ہیں، زیادہ سے زیادہ بڑے پیمانے پر استعمال کرتے چلے جائیں اور اس مقصد سے قرض کے تمام ممکن حربے کام میں لاتے رہیں، اسی قدر صنعتی زلزلوں کے جھٹکے بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ ان زلزلوں سے کاروباری دنیا خود کو صرف اسی تدبیر سے بچاتی ہے کہ پاتال کے دیوتا کے مندر پر دھن دولت کا ایک حصہ، اپنے سامان کا، یہاں تک کہ پیداواری طاقت کا ایک بھاگ بلیدان کر دے، مختصر یہ کہ بحران زور پکڑ جاتے ہیں۔ ان بحرانوں کی بہتات اور ان کا زور بڑھنے کی وجہ یہ کہ جب تیار ہونے والا سامان بہت بڑھ جاتا ہے اور ضرورت پڑتی ہے کہ اس کی کھپت کی منڈی بھی بڑھے تو دنیا کی منڈی اور بھی سکڑ جاتی ہے، نئی منڈیاں جن میں مال کھپا کر منافع بٹورا جائے، اور بھی کم رہ جاتی ہیں، کیونکہ جو بحران گزر چکا ہے وہ پہلے ہی دنیا کے بیوپار کو یا تو نئی منڈی دے گیا یا ایسی منڈیاں جنہیں اندر تک نہیں کھر چا گیا تھا۔ مگر محنت کے بل پر سرمایہ صرف زندہ ہی نہیں رہتا بلکہ پرانے زمانے کے آقاؤں کی طرح، جن کے ساتھ غلام دفن کر دئے جاتے تھے، سرمایہ اپنے بندوں کی لاشیں بھی قبر میں ساتھ لے جاتا ہے۔ جو مزدور بحران کے وقت مارے گئے ان کے بھرے جنازے بھی اٹھائے جاتے ہیں۔ اس طرح سے یہ بات صاف ہو گئی کہ: اگر سرمایہ تیزی سے بڑھتا ہے تو مزدوروں کے درمیان مقابلہ بڑھنے کا کوئی تناسب ہی نہیں یعنی جتنی تیزی سے سرمایہ بڑھے گا اتنی ہی تیزی سے روزگار کے ذریعے سکڑتے جائیں گے، اور وہ ذریعے بھی جو مزدور طبقے کے لئے گزراوقات کا سہارا ہوتے ہیں۔ تاہم یہ بھی ہے کہ سرمائے کا تیزی سے بڑھنا ایسی شرط ہے جو اجرت پر بسر کرنے والی محنت (مزدوری) کے لئے سازگار ہوتی ہے۔

دسمبر 1847 کے دوسرے پندرھواڑے میں کارل مارکس نے جو لیکچر دیئے تھے، انہی کی بنیاد پر یہ پمفلٹ خود لکھا۔ "Neue Rheinishe Zeitung" اخبار کے شمارہ 267_264 تک اور اور 269 میں، 8_5 اور 11 اپریل 1849 کو شائع ہوا۔ اینگلز نے برلن میں 1891 میں اس کا دیباچہ لکھ کر علیحدہ پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا۔

حواشی

(1): "مزدوری اور سرمایہ" شائع کرتے وقت مارکس نے یہ مدنظر رکھا کہ ان معاشی رشتوں کے عام فہم زبان میں پیش کیا جائے جو سرمایہ داری سماج میں طبقاتی کش مکش کی مادی بنیاد ہوتے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ پرولتاریہ کے ہاتھ میں نظریاتی ہتھیار دے دیا جائے، اسے اچھی طرح یہ ذہن نشین کر دیا جائے کہ سرمایہ داری سماج میں بورژوازی کے طبقاتی اقتدار کی جڑ بنیاد یہی مزدوروں کی اجرتی غلامی ہے۔ قدر زائد کے اپنے نظرئے کی داغ بیل ڈالنے کے بعد اسے آگے بڑھاتے ہوئے مارکس نے ایک مجموعی نظریہ تیار کیا کہ سرمایہ داری میں مزدور طبقہ نسبتاً بھی مفلس ہوتا جاتا ہے اور اس کا افلاس قطعی طور سے بھی بڑھتا ہے۔ موجودہ ایڈیشن میں 1891 والی اس عبارت کو لفظ بلفظ شائع کیا جا رہا ہے جسے اینگلز نے ترتیب دیا تھا۔

(2) (Neue Rheinische Zeitung OrganDer Demokratie) جرمن زبان کا روزنامہ تھا جو کولون شہر سے مارکس کی ایڈیٹری میں پہلی جون 1848 سے 19 مئی 1849 تک نکلتا رہا۔ اس کی ادارت میں مارکس کے ساتھ اینگلز بھی شریک تھا۔

(3) **جرمن مزدوروں کی سوسائٹی**: برسلز میں مارکس اور اینگلز نے اگست 1847 کے آخر میں یہ سوسائٹی اس مقصد سے قائم کی تھی کہ ان جرمن مزدوروں میں سیاسی بیداری پھیلائی جائے جو بیلجیئم میں رہتے ہیں، انہیں علمی کمیونزم کے نظریات سے آشنا کیا جائے۔ مارکس، اینگلز اور ان کے حامیوں کے زیر اثر یہ سوسائٹی بیلجیئم کے اندر رہنے والے جرمن انقلابی مزدوروں کو اکٹھا کرنے کا ایک قانونی مرکز بن گئی۔ اس سوسائٹی کے خاص خاص ممبر "کمیونسٹ لیگ" کی برسلز والی شاخ کے بھی ممبر ہو گئے۔ فرانس میں فروری 1848 کا بورژوا انقلاب چھڑتے ہی بیلجیئم کی پولیس نے گرفتاری اور جلاوطنی کا ہنگامہ اتنا گرم کیا کہ آخر جرمن ورکرز سوسائٹی ٹھنڈی پڑ گئی۔

(4): یہ اشارہ ہے اس طرف کہ 1849 میں زار روس کی فوج نے ہنگری میں قدم بڑھایا تا کہ وہاں بورژوا انقلاب کو دبا دیا جائے اور آسٹریا کے ہیپسبورگ شاہی خاندان کا اقتدار پھر بحال کر دیا جائے۔ (5): مطلب یہ کہ مئی جولائی 1849 تک جرمنی میں عام شورش ہو گئی تھی۔ فرینک فورٹ کی پارلیمنٹ نے 28 مارچ 1849 کو ایک شاہی قانون منظور کیا تھا جسے کئی جرمن ریاستوں نے نامنظور کر دیا، یہ شورش اس کی حمایت میں تھی مگر چوں کہ شورش خود بخود اٹھی تھی اور اس میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں تھی، اسے جولائی 1849 میں کچل دیا گیا۔

(6) مارکس کے کاغذات میں سے بعد میں ایک مسودہ ملا۔ اجرتی محنت (مزدوری) اور سرمائے کے مسئلے پر مارکس نے جو لیکچر دئے تھے ان کا سلسلہ یکجا کر کے اس پر خاتمہ لکھنا تھا اور یہ اسی کا

کچا خاکہ تھا جسے "اجرتیں" کے عنوان کے تحت رکھا گیا تھا۔تحریر کے اوپر "بروسلز، دسمبر 1847" کے الفاظ بھی درج تھے۔مضمون پڑھنے سے معلوم ہوت اہے کہ یہ مسودہ بھی اسی مقالے کی ایک کڑی تھی جو "مزدوری اور سرمائے" کے عنوان سے لکھا گیا مگر اس تحریر کے آخری باب، جو پریس میں بھیجنے کے لئے تیار تھی، مارکس کے کاغذات میں کہیں دستیاب نہیں ہوئے۔

(7): مارکس نے اپنی تصنیف "سرمایہ" میں لکھا ہے کہ " کلاسیکی معاشیات سے میرا مطلب ہے وہ معاشیات جس نے ولیم پیٹی کے زمانے سے آج تک یہ چھان بین کی ہے کہ بورژوا سماج میں پیداوار کے اصل رشتے کیا ہیں۔" کلاسیکی سیاسی معاشیات کے بڑے ترجمان برطانیہ میں یہ دو آدمی گزرے ہیں: آدم اسمتھ اور ڈیوڈ ریکارڈو۔(8) اینگلز نے اپنی تصنیف "اینٹی ڈیورنگ" میں لکھا ہے "سیاسی معاشیات کا علم اگرچہ 17 ویں صدی کے آخر میں کچھ غیر معمولی دماغوں کے اندر ابھرا تھا، تاہم اپنے محدود معنوں میں جیسا کہ اسے سرمایہ دارانہ کاشتکاری کے حامیوں (Physiocrates) نے اور آدم اسمتھ نے معین کر دیا ہے، اصل میں اٹھارویں صدی کی ہی پیدائش کہنا چاہیے۔"

(9) اینگلز کا اشارہ ہے 1891 کے یوم مئی کے تہوار کی طرف۔بعض ملکوں مثلاً برطانیہ اور جرمنی میں پہلی مئی کا تہوار مئی کے پہلے اتوار کو منایا گیا۔1891 میں 3 مئی کو پہلا اتوار پڑا تھا۔

(10) 1848 کے مارچ میں پروشیا میں انقلاب برپا ہوا تھا، یہاں اس کی طرف اشارہ ہے۔

اس کتاب کو مارکسسٹس انٹرنیٹ آرکائیو marxists.org کے لیے ابن حسن نے ترتیب دیا۔

کمپوزنگ: نوید احمد

پروف ریڈنگ: نوید احمد، ابن حسن

اپنی رائے اور تجاویز کے لیے درج ذیل پتے پر رابطہ کریں۔

hasan@marxists.org